Women Writers' Classics

افسانے

گھونگھٹ اُٹھائی

امرتا پریتم

RHOTAS LPS

Low Priced Series

گھونگھٹ اُٹھائی

افسانے

امرتا پریتم

روہتاس بکس

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پٹیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

گھونگھٹ اٹھائی

ترتیب

گھونگھٹ اٹھائی 5

پانچ بہنیں 12

وہ عورت 25

دو انچ کا فرق 30

دوسری بار 33

کیلے کا چھلکا 38

تخلیق 45

ایک نمبر کا فرق 53

ملاح کا پھیرا 62

اپنی کہانی 70

گھونگٹ اٹھائی

یہ دنیا کی سب سے بڑی کہانی ہے اور سب سے چھوٹی بھی---- بخشے کے گاؤں میں ہم صرف اکیلے زمیندار تھے۔ لیکن معلوم نہیں اس کا مٹی سے رشتہ کیوں ٹوٹتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گاؤں کے ساتھ بہتی نہر کے کنارے ہر روز شام ڈھلے دیر تک بیٹھا رہتا اور دور سے گاؤں کی جلتی روشنیوں کو گھورتا رہتا۔ گاؤں کچھ اونچائی پر تھا' اس لئے یہ قصبہ یوں دکھائی دیتا جیسے اندھیرے کے تالاب میں ٹمٹماتا ہوا دیا' اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قصبے سے آگے کہیں دور ایک بہت بڑا جگمگاتا ہوا شہر ہے۔

یہ روشنی بہت دور تھی۔ لیکن جب بھی شام ڈھلتی اسے محسوس ہوتا یہ روشنی اسے بلا رہی ہے۔ اور ایک دن اس نے مٹی سے رشتہ توڑ کر' پاؤں کو دھو پونچھ کر جوتا پہن لیا۔ اور اپنے ناراض ہوئے ماں باپ سے چند روپے لے کر شہر کا راستہ پکڑ لیا----

اور پھر اس نے بخشے سے مسٹر بخشی ہونے کا ایک طویل سفر طے کر لیا۔ دفتر میں اس کی ہستی ایک چھوٹے سے کلرک کی تھی۔ لیکن سرخ پتھروں کی اس عمارت کے دروازے میں سے گزرتے ہوئے روز اس کے پاؤں زمین سے اونچے ہوتے جاتے تھے۔

وہ کوٹ اور پتلون پہنے بڑی گھمبیر چال سے دفتر میں جاتا۔ لیکن اس کے اندر چھپ کر بیٹھا ہوا بخشا روز ایک بار تہبند پکڑے ایڑھیاں اٹھا کر اس دفتر کی اونچی عمارت کو دیکھتا تھا۔

اب شہر میں اس کے کئی واقف تھے اپنے ہی دفتر کے کلرکوں کی بستی والے لیکن گاؤں کے اونچے کنویں والیوں کے کرمے اور گھوڑوں والے سرداروں کے بیٹے جاگیرے ایسا ضدی کوئی نہ تھا۔ اس لئے اب اپنا ساتھی وہ صرف آپ تھا۔

ایک بار اس نے معلوم نہیں کس لہر سے دفتر کے ایک کلرک کو کہہ دیا کہ "یہ دہلی بڑی عجیب ہے۔ یہاں تنگ گلیاں بھی ہیں او شاہی محلوں ایسے گھر بھی پھولوں سے لدھے باغ بھی اور کھنڈر بھی۔ اور ساتھ ہی کہہ دیا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں خود دہلی ہوں" اور یہ دہلی میرے اندر ہو۔

کلرک ساتھی نے یہ بات دوسرے ساتھی کو بتا دی' اور دوسرے نے تیسرے کو۔ اس طرح کلرکوں کی ٹولی نے اسے "مسٹر دہلی" کہنا شروع کر دیا اور پھر اس نے کسی سے بھی جھوٹی موٹی بات کرنا بھی ترک کر دی۔

اب وہ صرف اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ زیادہ وہ جس کی اسے سمجھ نہیں آتی تھی اب یہ ایک بات بھی اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ "پیروں واہنا جب کھیت میں ہل چلاتا تھا تو دھرتی کو اوپر کر کے آسمان کی طرف کیا دیکھتا تھا۔ اور اب جب پاؤں میں بوٹ جرابیں پہن کر اس نے مٹی سے پاؤں کے لمس کو توڑ لیا۔ تو ایسا کیوں لگتا ہے کہ اس کے پاؤں کے نیچے دھرتی کوئی نہیں اور وہ خلاء میں کھڑا ہے۔

کئی برس پہلے گاؤں کے بڑے اسکول میں بڑی کرسیوں نے اس میں کشش پیدا کی تھی۔ لیکن وہ میٹرک پاس کر کے اب دفتر کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تو کرسیوں کی خواہش کہاں چلی گئی۔

اسے محسوس ہوتا گاؤں والا بخشا جو اس کے ساتھ آیا تھا۔ اب وہ اسے شہر میں اکیلا چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

وہ سوچتا' وہی بخشا تو شہر کو اچنبھے سے دیکھا کرتا تھا۔ وگرنہ شہر میں دیکھنے کے لئے کیا پڑا تھا۔ روز گھڑی کی سوئی کی طرح گھوم کر وہیں آ جاتا۔ وہ روز صبح دفتر کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ جاتا اور روز رات کو ایک کوارٹر کے چھوٹے سے

کمرے میں سو جاتا۔

اسے سمجھ نہیں پڑتی کہ گاؤں میں جب وہ ڈھور ڈنگر کے لئے چارہ کاٹتا تھا تو اس کی آنکھوں کے سامنے کتابیں اور کاغذ پھیل جاتے تھے اور اب جب اس کے آگے دفتر کی فائلوں کے کاغذ ہی کاغذ پھیلے ہوئے ہیں۔ تو اس کی آنکھوں کی چھبن کیوں بن گئے ہیں۔ اس کی آنکھیں کاغذوں میں کھبتی کیوں نہیں۔

اور آپ اپنے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ فائلوں کے کاغذ' کتابوں کے کاغذ ایسے نہیں ہوتے اس نے تعلیم کی اگلی ڈگری لینے کے لئے نائب کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور ساتھ اپنے علم کے لئے لائبریری کی کتابیں بھی۔۔۔۔

ان کتابوں میں اس نے ایک دن شعر و شاعری کی کتاب پڑھی تو اسے محسوس ہوا۔ جیسے اس کے پاؤں کے نیچے ایک دھرتی آ گئی ہو۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ اسے محسوس ہوا۔ دور کہیں شعر و شاعری کا ایک شہر ہے اور اس کی ٹمٹماتی روشنیاں اسے بلا رہی ہوں۔

معلوم نہیں کتنے دن' کتنے میل' وہ ان روشنیوں کی طرف چلتا رہا اور پھر ایک رات شعر و شاعری کی ایک کتاب پڑھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کتاب ایک لڑکی کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب پر اس کی تصویر بھی تھی اور اس کا نام لکھا تھا۔ "امرتا پریتم"

اس کے بدن کے بالوں میں ایک تناؤ آ گیا۔ جوانی اسے گاؤں میں چڑھی تھی لیکن گاؤں میں کسی کونے میں پڑی پوری ایسی لڑکی نے بھی اس کے بدن میں ایسی جھنجھناہٹ نہ چھیڑی اور پھر شہر آ کر اس نے رنگ برنگی تتلیوں ایسی لڑکیوں کو دیکھا ذکسی تتلی ایسی لڑکی نے بھی اس کے بدن میں چنگاری نہیں جلائی۔ اور وہ حیران ہو کر اس کتاب والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

زندگی میں پہلی بار اس کے تن بدن میں کسی لڑکی کے لئے پیاس جاگی اور وہ ساری رات کبھی مہندی گھول کر اس کتاب والی لڑکی کے ہاتھوں پر لگاتا۔ اور کبھی تاروں والا ڈوپٹہ اس کے چہرے سے اٹھاتا رہا۔

پھر دوسرے دن صبح سویرے اسے محسوس ہوتا رہا۔ جیسے وہ لڑکی ابھی اٹھ کر کمرے میں سے باہر گئی ہو اور اس کی نظم کی سطریں ابھی تک چارپائی پر پڑی ہوں۔

پھر کئی دن اسے اپنا صبح کا اٹھنا' چائے پینا' دفتر جانا' تندور سے روٹی کھانا۔ اور پھر رات کے کالج میں پڑھنے جانا۔ سب کچھ ایک نظم کی سطروں کی طرح محسوس ہونے لگا' ایک روشنی میں بندھا ہوا۔

اور پھر اچانک۔ جب موسم بدلتا ہے۔ اسے کے گرد ایک خلا سا چھا گیا۔ اس پر اس کی اپنی خاموشی کا ہنگارا پڑنے لگا تو اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس چپ میں جم جائے گا۔ اس نے تڑپ کر اپنی صورت کو ہلانا چاہا۔ اور پھر اچانک اس کے کانوں میں خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز سنائی دی---- اس کے نئے خریدے ریکارڈ پلیئر پر لتا منگیشکر گا رہی تھی۔

اسے خاموشی کی کھنڈر میں پڑے ہوئے کو جیسے کسی کوئل کی کوک ایسی آواز سنائی دی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر ریکارڈ کے آخری سرے پر پہنچی ہوئی سوئی کو پھر سے شروع میں رکھ دیا کہ اس پر پھر وہی عالم چھا گیا۔ اس میں وہی گرم سی سرسراہٹ کرنے لگی اور وہ ساری رات لتا منگیشکر کی انگلی میں سونے کی انگوٹھی ڈال کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اور لتا منگیشکر زری والے پلو کی ساڑھی پہن کر ساری رات اس کی چارپائی پر سوتی رہی۔

وہ رات' اور پھر کئی راتیں وہ لتا منگیشکر کی آواز میں ڈوبا رہا۔

اور پھر وہ آپ معلوم نہیں کس طرح اس آواز سے گہرا جیسے خاموشی کے تالاب میں ڈوب گیا ہو۔

اور پھر ایک صبح کی بات ہے۔ اس نے اخبار میں چھپی ہوئی ایک پری ایسی لڑکی کی تصویر دیکھی اور اخبار پڑھی کہ ہندوستان کی یہ رقاصہ مس انڈین چنی گئی ہے۔ اور پھر اس کی آنکھیں تصویر کی آنکھوں ایسی ہو گئیں۔ جو جھپکتی نہیں تھیں۔

اور اس نے بمشکل اس کا نام پڑھا۔ اندرانی رحمٰن!

اور پھر اس کے کانوں میں پڑی گھنگھروں کی چھنک کے ساتھ ساری رات

اپنے بیاہ کے گیت سنائی دیتے رہے۔

اس کے گلے میں پڑا ہوا گھر کے کھدر کا کرتہ چٹے سلک کا ہو گیا۔ اور وہ ساری رات اندر رانی کے لئے سچے موتیوں کے ہار خریدتا۔

اس نے کہیں پڑھا بھی اور سنا بھی کہ اندر رانی آدھی بنگالن ہے اور اسے روز رات کو گز گز لمبے بالوں والی اندر رانی سے ناریل گیری کی مہک سی آنے لگی۔

اک صبح اس کے کمرے کے فرش پر پڑا ہوا پتھر اس کے پاؤں کے ساتھ اٹکا تو اسے محسوس ہوا جیسے اندر رانی کے پاؤں کا گھنگھرو رات فرش پر گر پڑا۔ اخباریں جیسے موسم کا حال بتاتی ہیں اور کئی خبریں بنا کر موسمی رتیں بدل دیتی ہیں۔ چند دنوں کے بعد اس نے اخبار میں پڑھا کہ اندرانی رحمٰن یورپ چلی گئی ہے۔

اور رات کا جادو ٹوٹ گیا۔

وہ ایک خلاء میں رہ گیا جیسے نہ پاؤں کے نیچے زمین ہو اور نہ سر پر کوئی آسمان۔

ایک شام ڈھلے وہ بھٹکتا۔ جے پور ہاؤس کی آؤٹ گیلری میں چلا گیا وہاں رنگوں کی ایک دنیا تھی۔ جو دیواروں پر بسی ہوئی تھی۔ بہت چہرے تھے۔ خاموش اور اداس۔ لیکن اسے محسوس ہوا۔ جیسے وہ ان کے ساتھ باتیں کر رہا ہو۔ اور ان کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ سکتا ہو۔

اور پھر ایک چہرے کے سامنے وہ یوں آ کھڑا ہوا جیسے اس نے ساری عمر وہی کھڑا رہنا ہو۔

پھر گیلری کے بعد ہونے کا وقت ہو گیا چند کمروں کے دروازے بند بھی ہو گئے تھے۔ اور گیلری کا چوکیدار اس کے جانے کے انتظار میں اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور چند منٹوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "صاحب، کل پھر آ جانا۔ گیلری کے بند ہونے کا وقت ہو چکا ہے۔"

اسے جیسے کسی نے خاموشی کی قبر سے نکال دیا ہو۔ اس نے پوچھا "یہ تصویر کس کی ہے؟"

گیلری کا چوکیدار حیران ہو کر کہنے لگا- یہ اس کی اپنی ہے- جس نے یہ سب تصویریں بنائی ہیں- آپ نہیں جانتے - یہ ہندوستان کی سب سے بڑی پینٹر ہے- امرتا شیر گل! اور آج بہت دنوں کے بعد بخشی کے دل کا عالم پھر وہی ہونے لگا- جو کبھی پہلے اندرانی رحمٰن کے وقت ہوا تھا- لتا منگیشکر کے وقت ہوا تھا- امرتا پریتم کے وقت ہوا تھا-

اس کے کانوں میں اچانک شہنائی کی آواز سنائی دینے لگی- او پھر یکدم اس کے کانوں میں قبروں کی سی خاموشی چھا گئی- گیلری کا چوکیدار کہہ رہا تھا- بہت سال ہوئے امرتا شیر گل مر گئی- بڑی جوان مر گئی اگر جیتی رہتی-

بخشی کا اپنا بدن جیسے غائب ہو گیا صرف خلاء میں بھٹکتا دل رہ گیا- میں اس دنیا میں اتنے برس دیر سے کیوں آیا- بہت دیر ہو گئی---- میں خالی دنیا میں کس طرح آ گیا-

مسٹر بخشی رات کے کالج سے بی اے کی ڈگری لے چکے تھے- اور ایم اے کی بھی- تب ایک دن اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے اپنے آپ کو بتایا- شاید ایک شاعر ہونا میرا ایک خواب تھا- اور اس کی پرچھائیں میں امرتا پریتم کے ساتھ آپ اپنا بیاہ سوچ لیا-

شاید میں سروں کا علم جاننا چاہتا تھا- اس لئے لتا کی انگلیوں میں بیاہ کی انگوٹھی پہناتا رہا- شاید رقص میری سوچ میں تھا- تبھی میں اندرانی کے گلے میں شکوں کے ہار پہناتا رہا- اور شاید مصوری مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی اس لئے امرتا شیر گل-

اور اس دن بخشی اپنے دفتر کی کرسی پر یوں بیٹھا رہا جیسے کوئی ملاح تمام بیڑیاں پانی میں ڈبو کر کنارے پر بیٹھا ہو-

میں کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتا' صرف ایک کلرک---- اور بخشی کی میز پر پڑی ہوئی فائلوں کے تمام کاغذات جیسے ہوا میں اڑنے لگے ہوں- پھر گاؤں سے خط آیا- جس میں ماں باپ کی منت سماجت بھی تھی اور حکم بھی' تو بخشی نے ہارے

ہوئے ہاتھوں سے اپنے دفتر میں استعفیٰ دے کر گاؤں میں چلا آیا۔

اور پھر جیسے اس کے ماں باپ نے کہا بخشی نے ان کے کہے کے آگے جھکا ہوا سر اور جھکا دیا۔ انہوں نے کھیتوں کے ہل پنجالی اس کے ہاتھ پکڑا دیئے اور اونچے گاؤں والے ساہوکار کے گھر سے ڈولی لا کر سرخ سالو میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی اس کی کوٹھری میں بٹھا دی۔

یہ پہلی رات تھی۔ ماں نے لوہے کے صندوق میں سنبھال کر رکھے ہوئے سونے کی پانچ مہریں نکال اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ لڑکی کا گھونگٹ اٹھانے کے لئے اس نے پانچوں میں سے ایک مہر ماں کو لوٹا دی۔ چار مہروں کو اپنی ہتھیلی میں دبائے اندر کوٹھری میں سوتی پلنگ پر بیٹھی گھڑی ہوئی دلہن کے قریب کھڑے اسے محسوس ہوا۔ جیسے وہ چار مہریں' خوابوں کی چار دلہنوں کو آج ایک حقیقت کی گھونگٹ دکھائی دے رہا ہو۔

پانچ بہنیں

ایک بڑے ملک کا قصہ ہے کہ ایک دن ٹھنڈے بلوری پانیوں نے زندگی کے خوبصورت اعضاء کو مل مل کر دھویا۔ پھولوں نے جی بھر کر خوشبو لگائی اور سات رنگوں نے زندگی کے لئے پوشاک پیش کی۔ سورج نے اپنی کرنوں کی وساطت سے پھلوں میں رس ٹپکایا۔ زندگی نے اپنی آنکھوں میں تسکین چھلکا کر ہوا سے یوں کہا "میں نے سنا ہے کہ اس صدی کی پانچ لڑکیاں ہیں۔ جوان اور خوبصورت....."

"ہاں!"

"آج میں ان کے ہاں جاؤں گی۔"

ہوا ہنسنے لگی۔

"میرے پاس پانچ سوغاتیں ہیں۔ ایک سی قیمتی۔ میں ان سب کو ایک ایک سوغات دوں گی۔ کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟" زندگی نے ہوا سے پوچھا۔

"جیسے تم کہو۔"

"سب سے پہلے میں پانچ بہنوں میں سب سے بڑی کے گھر جاؤں گی۔"

"اچھا، مگر اس کے گھر میں دروازے اور کھڑکیاں بالکل نہیں صرف ایک دروازہ ہے۔ جب اس کا خاوند گھر سے جاتا ہے تو جاتے ہوئے۔ دروازے کو لوہے کا قفل لگا دیتا ہے۔ واپسی پر وہی قفل باہر سے کھول کر اندر لگا دیتا ہے۔"

"تم مجھے اپنے اندر سمولو۔ خوشبو کی طرح۔ اس طرح میں تمہارے ساتھ اس کے گھر میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں، نہیں، خوشبوؤں سے میں بوجھل ہو جاتی ہوں لہٰذا میں کسی جھری

سے بھی مکان میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جتنی دیر میں دیواریں پھلانگ کر میں اس کے گھر پہنچتی ہوں، میرے جسم کا ایک ایک عضو چور چور ہو جاتا ہے۔"

ہوا زندگی کو پانچ بہنوں میں سب سے بڑی کے گھر لے گئی۔

اس بڑی دیوار پر بہت سی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں تصویریں..... ہزاروں تصویریں۔ زندگی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ دیوار صدیوں سے بنی ہوئی ہے۔ جب اس گھر کی کوئی عورت ان دہلیز کو عبور کئے بغیر مر جاتی ہے تو اس ملک کے لوگ اس عورت کی تصویر اس دیوار پر بنا دیتے ہیں۔"

"اس گھر کی کوئی عورت ان دہلیزوں کو عبور نہیں کرتی۔"

"نہیں زندگی..... کبھی نہیں۔"

"ان دیواروں کا کیا نام ہے؟"

"روایات! کوئی خاندان کو روایت ہے، کوئی مذہب کی اور کوئی سماج کی....."

"مگر میں اس گھر کی عورت کو ایک بار دیکھنا چاہتی ہو"

"سورج کی کرنوں نے بھی اس گھر کی عورت کو نہیں دیکھا تم بھلا کیسے دیکھ سکتی ہو؟"

"لیکن یہ بیسویں صدی ہے۔ اے ہوا! تم کون سی صدی کی باتیں کر رہی ہو؟"

"یہاں صدیاں گھر کے باہر سے ہی گزر جاتی ہیں۔ دس صدیاں ادھر ہوں یا ادھر۔ اس گھر میں بسنے والوں کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"میں اس کے لئے ایک سوغات لائی تھی۔"

"تمہاری سوغات اگر اس کے پاس پہنچ بھی جائے تو وہ اسے ہاتھ نہیں لگائے گی۔"

"کیوں؟"

"کیوں کہ دنیا کی ہر شے اس کے لئے ممنوع ہے۔"

"کیا وہ میری آواز نہیں سنے گی؟"

"نہیں' اس کے کانوں کے لئے اس دیوار کے باہر سے آنے والی ہر آواز کی ممانعت ہے۔"

"اے ہوا! تم کیا باتیں کر رہی ہو؟ آخر وہ جوان ہے۔"

"اے زندگی! تم برسوں کا حساب لگا رہی ہوگی۔ اس گھر کی عورت کبھی جوان نہیں ہوتی۔ بچپن میں ہی اس پر پیری کے نشانات ہویدا ہوجاتے ہیں۔"

زندگی کے پاؤں میں ایک لرزش اٹھی۔ وہ شکست خوردہ اور سہمی سہمی آگے چلنے لگی۔

"یہ اس صدی کی دوسری لڑکی ہے۔" ہوا نے کہا۔

"کون سی؟"

"وہ جو سامنے ریلوے لائن سے کوئلے چن رہی ہے۔"

ایک تیس سالہ عورت نے بائیں ہاتھ سے اپنی کمر پر پھٹی ہوئی قمیض کو دوپٹے سے ڈھانپا اور دائیں ہاتھ سے اپنی ٹوکری میں ایک مٹھی بھر کوئلہ ڈالتے ہوئے کوئی دس گز کے فاصلے پر زمین پر لیٹی ہوئی اپنی بچی کو جھانکا۔ بچی کے رونے کی آواز اب تیز ہوگئی تھی اس عورت نے ٹوکری ایک طرف رکھدی اور اپنی بچی کو اپنی جھولی میں ڈال لیا۔ لڑکی نے ماں کی چھاتی کو کئی بار مونہہ مارا لیکن اسے دودھ نہ مل سکا۔ اب وہ اور زور سے رونے لگی۔

زندگی نے قریب جاکر آواز دی "بہن!"

اس عورت نے جانے آواز سنی یا نہیں۔

زندگی نے اور نزدیک ہو کر پھر کہا "بہن"

اس عورت نے بیگانہ نگاہوں سے ایک بار دیکھا اور پھر اپنا دھیان دوسری جانب پلٹ لیا۔ جیسے اس نے بوجھا ہو کہ آوازیں کسی اور کو دی جاری ہیں۔"

زندگی کے ہونٹ کے جیسے تڑپ گئے "میری بہن"

عورت نے پھر اس کے طرف دیکھا اور بے گانگی سے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔"

عورت نے پھر اپنی توجہ اپنی روتی ہوئی بچی کی جانب مبذول کرلی۔ جیسے را گیروں کی باتوں سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"میں تیرے دیس آئی ہوں، تیرے شہر، تیرے گھر"

دیس، شہر اور گھر والی بات جیسے اس عورت کی سمجھ سے بالا تھی۔

"آج میں تیرے گھر رہوں گی"

عورت نے غصہ سے زندگی کی طرف دیکھا۔ جیسے زندگی کا اس سے اس طرح مذاق کرنا واجب نہ تھا۔

"تم لڑکی کو دودھ کیوں نہیں دیتی ہو۔ بچاری رو رہی ہے۔"

عورت نے ایک بار اپنے سوکھے ہوئے جسم کی طرف دیکھا۔ پھر روتی ہوئی لڑکی کے چہرے کو لیکن اسے اس سوال کا مطلب کچھ سمجھ نہ آیا۔ اگر اس کے پاس دودھ ہوتا تو کیا وہ بچی کو نہ پلاتی۔

"تمہارا گھر کتنی دور ہے؟"

"اس گندے نالے کے پار"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"مگر وہاں گھر کوئی نہیں، ایک سرکنڈوں کا چھپر ہے۔"

تیرا خاوند.....؟"

"وہ بیمار ہے؟"

"کیا کام کرتا ہے؟"

"کارخانے میں مزدور تھا۔ پچھلے سال کی تخفیف میں وہ نوکری سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔"

"اور پھر؟"

"ایک سال سے اسے بخار آرہا ہے۔"

"کیا یہ ایک ہی تمہاری بچی ہے؟"

"میرا ایک لڑکا بھی ہے مگر....."

"وہ کہاں ہے؟"

"ایک دن وہ بھوکا تھا' بہت بھوکا' اس نے ایک امیر آدمی کی موٹر سے سیب چرا لیا تھا۔ پولیس والوں نے اسے جیل میں ڈالدیا"

"میں تیرے گھر چلو؟"

"مگر تم کون ہو؟"

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔"

"میں نے کبھی تمہارا نام بھی سنا۔"

"کبھی..... کبھی بچپن میں..... بچپن میں تم نے ضرور کہانیاں سنی ہوں گی۔"

"میری ماں کو بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ میرا باپ کسان تھا' مگر وہ تھا ان کسانوں میں جن کی اپنی زمین نہیں تھی۔ میری بڑی بہن کی شادی پر ہم نے قرضہ لیا جو ہم لوٹا نہ سکے۔ ساہوکار نے ہمارے ڈنگر ڈھور چھین لئے تھے۔ میرا باپ بہت دور کہیں پردیس میں روز کمانے چل دیا۔ میری ماں رات کو سو نہیں سکتی تھی۔ وہ رات کو مجھے جگا کر کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ بھوتوں کی' جنوں کی..... مگر میں نے تمہارا نام تو کبھی نہیں سنا۔"

"پھر تیرا باپ کیا کما کر لایا؟"

"میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب وہ آئے گا تب وہ بہت سا سونا لائے گا۔ مگر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔" اس عورت نے سنبھل کر کہا۔ "تم میرے گھر جا کر کیا کرو گی؟"

"میں....." زندگی کچھ اور نہ کہہ سکی۔

وہ عورت کوئلوں کی ٹوکری پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تیرے لئے سوغات لائی ہوں۔" زندگی نے رنگوں اور خوشبوؤں کی پٹاری عورت کے سامنے رکھ دی۔

"نہیں بہن! تم ان کو اپنے پاس رکھو۔" عورت نے ڈرتے ہوئے ان سے اپنی نظر ہٹالی۔

"میں تیرے لئے لائی ہوں۔"

"نہیں بہن! کل کو پولیس والے کہیں گے کہ تونے کسی کی چوری کی ہے۔"

وہ عورت جلدی جلدی اپنے گھر کی جانب مڑی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ اب بھی زندگی اس کے پیچھے آرہی ہے' وہ ڈر کے مارے کھڑی ہوگئی۔

"میری بہن! تو لوٹ جا میرے ساتھ نہ آ۔ مجھے بیگانوں سے بہت خوف آتا ہے۔ پہلے بھی ایک بار..... ایک جوان شہری آیا تھا اور کہتا تھا کہ میں تیرے خاوند کو کام دلا دوں گا۔ اور تیرے لڑکے کو جیل سے رہا کرا دوں گا..... میں نے پڑوسیوں سے آٹا لے کر اس کی روٹی پکائی..... اور جب میں اپنے لڑکے کو دیکھنے کے لئے اس کے ساتھ شہر گئی..... تو راستہ میں....." اس عورت کے جسم کے ایک ایک عضو سے شعلے اٹھنے لگے اور وہ بے تحاشا بھاگ اٹھی۔

زندگی کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسوؤں کی ہوا نے اپنی ہتھیلی سے پونچھا۔ "آ' میں تجھے تیری بہن کے گھر لے چلوں۔" جس وقت زندگی ایک محل نما گھر کے آگے سے گزری تو ہوا نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ یہی اس کا گھر ہے۔"

دروازے پر کھڑے دربان نے زندگی کا راستہ روک لیا۔

اس کے بعد باندی کے ہاتھ پیغام بھیجا گیا۔ زندگی باہر انتظار کرتی رہی..... انتظار کرتی رہی جب اسے اندر آنے کی اجازت ملی تو وہ خادمہ کے پیچھے پیچھے کئی بلوری دروازوں کو عبور کرتی ہوئی اور ریشمی پردوں کو اٹھاتی ہوئی خاص کمرے میں پہنچی۔

سنگ مرمر کا ایک مجسمہ کمرے کے ایک کونے میں ایستادہ تھا۔ پانی کی پھوار اس کے جسم کو ڈھانپ رہی تھی۔ سنگ مرمر جیسا ایک اور عورت کا مجسمہ نرم کرسی پر پڑا تھا۔ ریشم کے تار اس کے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورت کے کھڑے بت کی کو آئی آواز نہ آئی۔ لیکن بیٹھے ہوئے مجسمے نے پوچھا "تم کون؟

میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

زندگی نے بدک کر چاروں طرف دیکھا' لیکن وہاں کسی عورت کا وجود نہ تھا۔ پھر زندگی نے کھڑے بت کو ہاتھ سے چھوا۔ وہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ پھر زندگی نے بیٹھے ہوئے بت کو ہاتھ لگایا۔ وہ ربڑ کی طرح ملائم تھا۔

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔" زندگی نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے یاد نہیں آرہا۔ لیکن یہ نام میں نے سن رکھا ہے۔ شاید بچپن میں کسی کتاب میں پڑھا ہو۔"

"کتاب میں؟"

"ہاں مجھے یاد آگیا۔ میری ایک ہم جماعت تھی۔ وہ گیت لکھا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے اپنے گیتوں کی کاپی دی تھی۔ اس میں اس نام کا ذکر تھا۔"

"اب وہ کہاں رہتی ہے۔"

"کتاب میں؟"

"ہاں مجھے یاد آگیا۔ میری ایک ہم جماعت تھی۔ وہ گیت لکھا کرتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے اپنے گیتوں کی کاپی دی تھی۔ اس میں اس نام کا ذکر تھا۔"

"اب وہ کہاں رہتی ہے۔"

"غریب لڑکی تھی۔ نہ معلوم کہاں رہتی ہوگی؟"

"مگر اس کی کاپی؟"

"اس نئی کوٹھی میں آتے ہوئے میں پرانا سامان نہیں لائی ہم نے یہ سب سامان خریدا ہے۔"

"بہت مہنگا خریدا ہے۔"

"میرا خاوند ملک کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اس دفعہ کے انتخابات میں بھی مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ بڑا آدمی' چنا جائے گا۔ ہم جب چاہیں ایسا یا اس سے اچھا سامان خرید سکتے ہیں۔" ربڑ جیسے ملائم مجسمے نے میز پر پڑے ہوئے پھل زندگی کو پیش کیے۔

پھلوں کے ہاتھ لگاتے ہیں زندگی کو بو محسوس ہوئی۔

"میں نے ابھی ابھی یہ پھل اپنے نوکروں سے تڑوائے ہیں۔ شاید خادمہ نے دھوئے نہیں۔ شاید تمہیں نوکروں کے ہاتھوں کی بدبو آرہی ہوگی..... آج گرمی..... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں آج....."

"اگر تم کہو تو میں تمہیں باہر کھلی اور ٹھنڈی ہوا میں لے چلتی ہوں۔" زندگی نے ایک سانس بھر کر کہا۔

"نہیں نہیں، میں ایسے باہر نہیں جاسکتی۔ اپنی برادری سے باہر کے لوگوں کے ساتھ گومنے پھرنے سے ہماری عزت میں فرق آتا ہے..... درحقیقت جب میرا آپریشن ہوا تھا تو اس میں کچھ کسر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے درد ہوتا ہے....."

زندگی نے اٹھ کر اس ربڑ جیسی ملائم عورت کا بازو دیکھا اور پھر اس کے جسم پر ہاتھ رکھا۔ "تمہارا دل کیوں نہیں دھڑکتا؟..... یہ پتھر کی طرح خاموش اور سرد ہے....."

"یہاں پر ہی تو نقص رہ گیا ہے۔ میرا خاوند کہتا ہے کہ اب کے ہم کسی دور سے دیس جائیں گے..... شاید امریکہ..... وہاں کے ڈاکٹر بہت لائق ہیں۔ میرا آپریشن دوبارہ ہوگا۔"

"کاہے کا آپریشن؟"

"جب کوئی لڑکی شادی کروا کر "بڑے گھر" میں آتی ہے تو شادی سے پہلی رات ملک کے عقلمند ڈاکٹر اس کا آپریشن کرتے ہیں۔ بڑے گھروں کی رسم ہے۔"

"شادی کی رات یہ آپریشن....."

"ہاں! اس لڑکی کے جسم کو چیر اس کا دل باہر نکال لیتے ہیں اس کی جگہ ایک سونے کی سل رکھ دیتے ہیں۔ بہت خوبصورت..... بہت مہنگی.....

میرے آپریشن میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی درد اٹھتا ہے..... ان انتخابات میں اگر میرا خاوند جیت گیا تو ہم اگلے مہینے ہوائی جہاز میں باہر جائیں گے۔ پھر میرا آپریشن ہوگا اور میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔"

"میں تیرے لئے سوغات لائی ہوں۔"

"نہیں، نہیں..... میرے خاوند نے مجھے کہہ رکھا ہے کہ آج کل میں کسی سے کوئی بھینٹ قبول نہ کروں۔ انتخابات نزدیک ہیں اور اس کے علاوہ ملک کی بڑی بڑی ملوں میں ہمارے حصے میں ہمیں یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں لینے کی کیا ضرورت ہے؟"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ربڑ جیسی ملائم عورت نے ٹیلی فون پر دو تین منٹ باتیں کرکے قریب بیٹھی ہوئی زندگی سے کہا "بہن اگر تمہیں میرے ساتھ کوئی کام ہو تو پھر تشریف لانا۔ اس وقت میرا خاوند اور اس کی پارٹی کے کچھ رکن ہمارے ہاں آرہے ہیں....."

ہوا نے زندگی کے ہاتھ کو تھاما اور اسے سہارا دے کر چوتھی بہن کے گھر لے گئی۔ بڑا سادہ گھر تھا۔ گھر کے دروازے کے سامنے ایک چمکتی ہوئی گاڑی کا مونہہ آنکھوں کو چندھیا رہا تھا۔ رات کی آمد آمد تھی۔ زندگی نے دہلز کے قریب ہوکر اندر جھانکا۔ بائیس تیئس سال کی ایک جوان عورت ایک بچے کو تھپکیاں دے کر سلا رہی تھی۔ کمرے کا سامان صرف گزارے کے لئے کافی تھا۔ اس جوان عورت کے کپڑے جھلملا رہے تھے۔ زندگی نے آہستہ سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

"کون..... ذرا آہستہ۔" جوان عورت دہلیز کے پاس آئی۔ "بچہ جاگ اٹھے گا۔"

پھر جوان عورت نے بدک کر کہا "تم..... تم؟" اس کی آواز لڑکھڑا گئی۔

"مجھے زندگی کہتے ہیں۔"

"مجھے علم ہے۔"

"تجھے علم ہے؟"

"میں تمام عمر تیری پرچھائیوں کے پیچھے دوڑتی رہی ہوں، اب میں تھک گئی ہوں۔ اب میں نے تیری راہ ترک کردی ہے۔ تم چلی جاؤ..... جہاں سے آئی ہوں وہیں چلی جاؤ تم دیکھتی نہیں ہو..... میرے دروازے کے آگے عذاب کی ایک لکیر

کھچی ہوئی ہے۔ تم اس لکیر کو پار نہیں کر سکتیں۔ تم اس لکیر کو نہیں مٹا سکتیں۔ تم چلی جاؤ..... تم چلی جاؤ....." جوان عورت کا سانس پھول گیا۔

"میری اچھی بہن"

"بہن؟ میں کسی کو بہن۔ میں کسی کی لڑکی نہیں۔ میں کسی کچھ نہیں....."

"یہ تیرا بچہ....." زندگی نے کمرے سوئے ہوئے بچے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا بچہ..... میرا بچہ..... مگر اس باپ کوئی نہیں"

"میں نہیں سمجھی۔"

"جب میرے دیس میں آزادی کی بنیادیں رکھی گئیں تو ان میں میری ہڈیاں ڈالی گئیں..... جب میرے ملک کی آزادی کا پودا لگایا گیا تو میرے خون سے پانی سے اسے سینچا گیا..... جس رات میرے دیس میں خوشی کا چراغ روشن ہوا اس رات میری عزت اور آبرو کے دامن کو آگ لگی..... یہ بچہ..... یہ بچہ اس رات تحفہ ہے۔ اس کی راکھ ہے۔ اس زخم کا نشان....."

"میری دکھی بہن....." زندگی نے ہمدردی سے جوان عورت کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"پھر میری تمام راتیں اس رات جیسی ہو گئیں۔ میں تیرے خواب دیکھا کرتی تھا میں نے سوچا کہ تو میرے سپنوں کی مہندی لگائے گی۔ میری ماں کے آنگن میں میرے دیس کے گیت گائے جائیں گے۔ اور پھر میں اپنے کانوں سے شہنائیوں کی دھنیں سنوں گی۔ میرے گاؤں کا ایک کڑیل جوان لڑکا میرے سپنوں کا راجہ تھا..... میں تیری پرچھائیوں سے کھیل رہی تھی۔ جب ہمارا گاؤں لوٹا گیا۔ جب میرے والد کو پیٹا گیا۔ جب میرے بھائیوں کو تہ تیغ کیا گیا۔ ایک سانپ نے مجھے بھی ڈس لیا۔ پھر ایک اور سانپ نے..... ایک اور نے..... یہ انسانی چہروں والے سانپ کس ڈھنگ کے ہیں جن کا کاٹا مرتا نہیں' ساری عمر اس کی زہر میں جلتا رہتا ہے..... پھر میں نے تیرا ایک اور سایہ دیکھا۔ میرے دیس کے لوگ کہنے لگے کہ مجھے ان سانپوں سے بچا کر لایا جائے گا..... ان کا زہر میرے جسم سے اتار دیا جائے

گا- میں دوبارہ پہلے سی اچھی اور پاک لڑکی بن جاؤں گی..... میں دوڑی تیری پرچھائیوں کے پیچھے..... یہ سب جھوٹ تھا..... میرے خوابوں کے شہزادے نے مجھے قبول نہیں کیا- مجھے اپنی دہلیز سے لوٹا دیا مجھے اپنے پاؤں سے علیحدہ کر دیا- پھر اس نے زہر میں سڑنے لگی- اس سانپوں جیسے اور سانپ کی گاڑی ہے- آج رات یہ مجھے کاٹے گی-"

زندگی بول نہ سکی- اس کے ہاتھوں میں پکڑ ہوئی سوغات اس کے آنسوؤں میں بھیگ گئی-

"یہ تم کیا لائی تھیں- سوغات..... میرے لئے؟ تم دیکھ نہیں رہی ہو' میرا سارا جسم زہر آلود ہے- میں جب تمہاری سوغات کو ہاتھ لگاؤں گی' اس کو زہر چڑھ جائے گا- ان رنگوں کو' ان خوشبوؤں کو..... میری نس نس میں زہر سمایا ہوا ہے- زہر' زہر!!"

ہوا نے نے بے ہوش زندگی کے مونہہ پر اپنے دامن سے ہوا کی جب زندگی کو کچھ ہوش آیا تو پانچویں بہن کے ہاں لے گئی-

بیس سال کی ایک مدھ بھرنے نینوں والی لڑکی کے ارد گرد بڑی کتابیں' ساز اور رنگ بکھرے پڑے تھے- زندگی نے اطمینان کا سانس لیا- اس کے سامنے سی متواتر نینوں والی لڑکی نے ساز کے تار چھیڑے اور ایک میٹھا گیت فضاؤں میں لہرا اٹھا- وہ لڑکی گاتی رہی- ستاروں جیسے آنسو اس کی آنکھیں میں چمکتے رہے- پھر اس نے رنگوں کی پتلی لکیر سے کاغذ پر ایک رنگین تصویر بنائی-

زندگی کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس فن کار لڑکی کے ہاتھوں کو چوم لے-

سروں کا' الفاظ کا اور نقشوں کا ایک جادو فضاؤں میں گھلا ہوا تھا- زندگی نے ایک گہری سانس لی- ہاتھوں میں رنگوں اور خوشبوؤں کی پٹاری لے کر آگے بڑھی-

لڑکی نے حیرانگی سے دیکھا-

"مجھے زندگی کہتے ہیں-"

"مجھے علم ہے....." لڑکی نے کہا' مگر وہ اس کے سواگت کے لئے آگے نہ

بڑھی۔ اچانک زندگی کے پیر رک گئے۔ لوہے کی باریک تاریں دروازے کے آگے بنی ہوئی تھیں۔

"میں اس وقت تمہارا خیر مقدم نہیں کر سکتی۔" لڑکی نے سر جھکا کے کہا۔

"کیوں؟" زندگی حیران تھی۔

"اگر تم کبھی رات کو آؤ' جب میں سو جاؤں' میرے سپنوں میں..... جب میں جاگ رہی ہوں تو میرے جذبات میں' تیرے ساتھ بہت باتیں کروں گی' بہت کچھ سناؤں گی اور سنوں گی۔ پہلے بھی میں ہر روز تیری چھائیوں کو پکڑتی تھی۔ یہ دیکھ میں ان رنگوں سے تیرے دامن کی تصویر کھینچ ہے۔ ان تاروں کو کھینچ کر تیرے گیت گائے ہیں۔ اور اس قلم سے میں نے تیرے پیار کے قصے بیان کئے ہیں۔"

آج جب میں خود چل کر تمہارے پاس آئی ہوں تو تم....."

"آہستہ..... بہت آہستہ..... میرے گھر کی سب دیواروں میں سوراخ ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں آنکھیں میری نگہبانی کرتی ہیں۔ وہ دیکھ ان سوراخوں میں ہر سوراخ سے دو بھیانک آنکھیں نظر آئیں گی۔ یہ آنکھیں لاوے سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ایک ایک زبان سے سینکڑوں تیر نکلتے ہیں۔ اگر میں تمہارے پاس بیٹھ جاؤں۔ تمہارے پاس..... تو ان کے تیر ابھی میرے رنگ کے پیالوں کو الٹا کر دیں گے۔ میرے سازوں کے تاروں کو توڑیں گے۔ میرے گیتوں کے ایک ایک لفظ کو زخمی کر دیں گے۔ اور ان آنکھوں کا لاوا.....

"مگر یہ لوگ تیرے گیت سنتے ہیں تیری کہانیاں پڑھتے ہیں۔ تیری تصویروں کو دیکھتے ہیں۔"

"یہاں کے فن کار تیری باتیں کر سکتے ہیں۔ مگر تیرا چہرہ نہیں دیکھ سکتے۔ جو تیرا چہرہ دیکھ لیتا ہے' اس منصور کو دار پر چڑھا دیتے ہیں۔ تم اب چلی جاؤ۔ کوئی دیکھ لے گا۔ میرے خوابوں کے علاوہ میرے پاس کوئی اور جگہ نہیں جہاں میں تمہیں بیٹھا سکوں۔"

"میں تیرے لئے ایک سوغات لائی ہوں۔"

"وہ بھی میں اس وقت لوں گی۔ تم ضرور آنا' میں سات بہشتیں تعمیر کروں گی۔ زندگی ' تم ضرور آنا۔ میں تمہاری سوغاتوں سے اپنی بہشتوں کو سجاؤں گی۔ تم ضرور آنا..... .....اور صبح اٹھ کر میں تمہاری محبت کا نغمہ لکھوں گی۔ تیرے حسن کی تصویر کشی کروں گی۔ تیرے بانک پن کا یہ گیت گاؤں گی۔ مگر اب تم چلی جاؤ..... کوئی دیکھ لے گا۔

لڑکی نے زندگی کی طرف اپنی پیٹھ پھیر لی۔

وہ عورت

میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا' تو اس نے ابرق کے رنگین کپڑے پہن رکھے تھے اگرچہ اسے دیکھنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ اس نے کوئی کپڑا نہیں پہن رکھا۔

میرا اس روزمرہ کا واسطہ تھا۔ جس ایڈورٹائزنگ کمپنی میں' میں فوٹوگرافر تھا اس کمپنی والوں نے اسے بطور ایک ماڈل گرل کے سائن کر رکھا تھا اور جس مل کا بزنس کمپنی کو ملا تھا اس کے لئے تصویریں مجھے ہی بنانا تھیں۔

وہ چھوٹے چھوٹے پھولوں والی ساڑھی' لائینوں والے کرتے اور کبھی بڑے بڑے پھولوں والی میکسی یا رنگا رنگ سلکی ملبوسات میں آفس آتی۔ لیکن میری آنکھیں پہلے دن والے ابرق لگے کپڑوں میں ہی جکڑی رہیں.....

مجھے ان تصاویر کے لئے کبھی دہلی کے فواروں والے کیفے میں جانا ہوتا۔ کبھی شاہی قلعہ کی سنگ مرمر کی دیواروں کے پاس کبھی کسی مقبرہ کے پتھر کی اوٹ میں اور کبھی قدیم کھنڈروں میں۔ لیکن ہمیشہ چند قدموں کا فاصلہ ہر جگہ ہمارے درمیان موجود رہا۔ ایک بات اور تھی وہ جہاں بیٹھ کر اپنی جگہ چھوڑتی۔ میری آنکھیں اس خالی جگہ کو دیکھتی رہ جاتیں۔ جیسے ابھی چند ابرق جھڑ کر گر پڑے ہوں۔

اس کی باتیں شہر کی ہوا میں اس طرح بسی تھیں جیسے پانی کو چھو کر آتی ہوا میں کچھ سیلن ہو' کھنڈرات کی طرف سے آتی ہوا میں کچھ ویرانی ہو شاہی باغ کی طرف سے آتی ہوا میں اتراتا پن ہو یا جیسے شہر کے اندرونی گلیوں میں آتی ہوا میں حبس اور سڑاند ہو اس طرح کی ملی جلی باتیں تھیں۔

سوچتا رہتا تھا کبھی وہ اس دھویں کو ایک پھونک سے اڑا دے گی مجھے معلوم تھا وہ جہاں رہتی ہے اور یہ بھی کہ وہ اکیلی رہتی ہے اور کبھی کبھی شام ڈھلے جب میرے بدن کا دھواں آگ بن جاتا تو میں اس کی اس دن والی نئی تصویر لے کر اسے دکھانے اس کے گھر چلا جاتا تھا۔ وہ میرے ہاتھوں سے تصویر یوں پکڑتی جیسے بجلی یا پانی کا بل پکڑ رہی ہو۔ اور اس کے بعد بل دینے والے کا کام ختم ہو گیا ہو۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک خبار میں ہفتہ وار کالم بھی لکھتی ہے شاید مزید پیسوں کے پیش نظر یا یونہی شوقیہ یہ معلوم نہیں۔

آفس سے وہ ہر سٹنگ کا ایک سو روپیہ لیتی تھی۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں۔ ان دنوں سو روپیہ بہت بڑا معاوضہ ہوتا تھا۔ اس کے گھر کے طریقے اور سلیقے سے تو کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن اچانک جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک اخبار کی طرف سے ملک سے باہر جا رہی ہے تو بجلی اور پانی کے بل کی طرح اس کے گھر جا کر اس دن والی تصویر دے کر پوچھا۔ "کیا تمہارے باہر جانے والی خبر درست ہے؟"

"شاید!"

اسے میری آواز۔ عام الفاظ سے کچھ زیادہ ہی گھمبیر محسوس ہوئی۔ وہ ہنس دی۔

"ابھی سوچ رہی ہوں۔"

"کیوں؟" میرے منہ سے نکلا اور یہ کہتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے بدن کا لہو میری رگوں میں سے نکل کر اس کی رگوں میں رچ چکا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک گلابی سی جھلک آئی' کہنے لگی' "کچھ تو کرنا پڑے گا!"

یہ جو کچھ ہے کیا کافی نہیں؟

وہ پھر ہنسی اور بولی۔ "لیکن کتنی دیر' دو چار برس یا شاید چھ سات برس۔ پھر۔ پھر؟؟ اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی اپنی تصویر دوبارہ مجھے دکھاتے ہوئے کہنے لگی۔ "یہ پھولوں والی ساڑھی کسی اور کے لئے ہو گی۔ اس کی عمر میری عمر سے کئی برس

چھوٹی ہو گی۔" اس نے ٹیبل لیمپ کے قریب پڑا سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا' اسے کھولا ایک سگریٹ نکالا اور سلگا کر کہنے لگی۔ "بہت دور تک دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

ساتھ ہی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ اشارہ تھا کہ میں اب جا سکتا ہوں۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن دروازے کی طرف نہیں بڑھا۔ محسوس ہو رہا تھا جس جرات کو دیر تک میں ٹال رہا تھا اگر آج بھی نہ کر سکا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حسرت بن جائے گی۔ یکایک میری بانہوں میں میرے سارے وجود کی بے بسی اکٹھی ہو گئی میں نے اس کے کندھوں کے گرد اپنا ہالہ بنا لیا۔ وہ بڑی سرد آنکھوں سے میری طرف کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ سے میری بانہوں کو اپنے کندھے سے یوں آہستگی سے ہٹایا جیسے پیچیدہ گانٹھ کوئی بڑے سلیقے سے کھول دے۔

اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن مجھے قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی وہاں بیٹھ گئی جہاں سے وہ ابھی ابھی اٹھی تھی۔ کچھ دیر چپ چاپ سگریٹ پیتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس سگریٹ سمیت۔ "بس یہی دیکھا ہے؟"

"کیا یہ کافی نہیں؟"

سوچ رہا تھا کہ شاید یہ سوچ میری آواز جیسی تھی جیسے اس نے سن لیا ہو وہ پہلا سگریٹ بجھا کر دوسرا سگریٹ جلاتے ہوئے کہنے لگی۔ سب نے یہی دیکھا ہے اس سے آگے کچھ نہیں۔ جس سے شادی کی تھی اس سے لے کر آج تک اور تو نے بھی چیلتن۔"

میں بھی کتنے ناموں میں شامل تھا کسی اور کے منہ سے یہ بات سنی ہوتی تو شاید میرے لئے بہت بڑی بات ہوتی لیکن اس کے منہ سے سن کر بہت چھوٹی لگی۔ اور اب اس میں شامل ہو کر میں بھی بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔ وہ ہنس دی۔ "اس نے طلاق لے لی تھی' اس آدمی کیلئے میں صرف ایک بدن تھی۔"

میرے اندر ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ یہ سب کیا تھا جو مجھے معلوم تھا۔ کئی دن سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ پر اپنی ہتھیلی رکھ دی جیسے میرے بدن کی نبض تلاش کر رہی ہو کہنے لگی مجھے پہلے یہ معلوم تھا کہ ایک دن کچھ اس طرح ہو گا لیکن چاہتی تھی کہ ایسا نہ ہو۔

"تجھے معلوم نہیں؟ میں ہر روز تیرے تصور میں....."

آگ کی طرح الفاظ کی چنگاریاں اس نے جیسے میرے ہاتھ پر جھاڑ دیں ہوں۔ وہ کہنے لگی۔ "چیتن جسم کی بھی ایک آگ ہوتی ہے لیکن وہ جسم سے ٹکرا کر بجھ جاتی ہے۔بعد میں سب کچھ ٹھنڈی راکھ بن کر رہ جاتا ہے۔

وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر خاموش ہو گئی پھر نئے کش کے ساتھ سگریٹ کی سلگتی آگ کی طرح کہنے لگی۔ کپڑوں کی طرح بدن اتارا جا سکتا ہے۔ لیکن کپڑوں کے بٹن کھول کر ہی سب کے ہاتھ رک گئے صرف جسم تک رہ جاتے ہیں اور جو کچھ اس سے آگے ہوتا ہے اس سے دور۔

ایسا محسوس ہوتا تھا اس کی آواز بہت دور سے آ رہی ہو شاید وہاں سے جہاں وہ اپنے سے بھی دور ہو گئی تھی۔ کہنے لگی "چیتن" تجھے ایک آنکھوں دیکھی بات سناؤں وہاں بمبئی میں معصوم سی بھولی بھالی ایک بڑی حسین لڑکی کو جانتی ہوں۔

میرے تمام حواس میرے کانوں میں آ گئے۔ اس لڑکی کو ایک بڑے فلمی ہیرو سے محبت ہو گئی۔ خیالی محبت پھریوں ہوا کہ ایک رات کے لئے سچ مچ وہ اس تک پہنچ گئی۔ وہاں اس طرح کا سب کچھ ہوتا رہتا ہے لڑکی کیلئے وہ رات سہاگ رات تھی۔ ایسی رات جس میں ہر آنے والی رات کا اندھیرا شامل تھا۔ اس رات وہ بادلوں میں ایسی اڑی کہ پھر دھرتی پہ نہ چل سکی۔ چند مہینوں میں پاگل ہو گئی۔ اس کا اس رات والا بچہ میں نے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یقین کر سکتے ہو چیتن وہ انسان کا بچہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ عجیب بدشکل، کچلے ہوئے گوشت کا ٹکڑا (جو کبھی روح سے ہٹ کر چلتا ہے اس کی راکھ میں سے یہی لجھ پیدا ہوتا ہے۔ یہ چاہے ایک بچہ ہو۔ چاہے محبت، چاہے کمیونزم۔)

میں اپنے اور اس ک بدن کے ایک کنارے پہ کھڑا تھا۔ اور وہ دن کے اس کنارے پہ کھڑا تھا۔ اور وہ بدن کے اس پار دوسرے کنارے پر۔ میں اسے دور سے دیکھ رہا تھا۔ سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "جب کوئی بدن سے پار جاتا ہے تو بدن دشمن نہیں رہتا دوست بن جاتا ہے۔"

اب اسے ملک سے باہر گئے ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں۔

عمر کا تقاضہ ہے اور کئی بدن سامنے ہیں۔ سوچتا ہوں اگر میں کبھی کسی سے شادی کروں گا تو اس کا بدن بھی ایسے بدنوں میں شمار ہو گا۔

تو کیا' سامنے سوکھی زمین ریتلی زمین ہو گی اور کچھ نہیں۔ کیا ایک بدن کی آگ دوسرے بدن سے ٹکرا کر بجھ جائے گی؟ اور پھر یہ سب کچھ ٹھنڈی آگ کی طرح کا ہو جائے گا؟ کیا کروں۔ بہت دور تک دیکھنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔

اس پار بہت سی عورتیں ہیں۔ لیکن وہ عورت کہیں نہیں۔ جس نے ابرق پہن رکھا ہو اور نہ ہی وہ جگہ ہے جہاں سے اگر کوئی اٹھ کر جائے تو وہاں کچھ جھڑ کر گر پڑے.....

دو انچ کا فرق

عشق ایک وہ بیماری ہے جس سے انسان تندرست بھی ہو سکتا ہے' لیکن یاد وہ نیم حکیم ہے۔ جس کی ہر پڑیا آپ کے مستقبل کی جان خطرے میں ڈالتی جاتی ہے۔

نیند ایک رشوت خور کنیز ہے' جو سپنوں سے رشوت لے کر انہیں تمہارے دل کے محلوں میں داخل کر دیتی ہے کہ تمہیں اس وقت پتہ جب چلتا ہے تب تمہارا یقین تم سے چوری ہو چکا ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر ایک نظم رسوئی گھر میں بنی ہوئی اس چمنی کی طرح ہے جن میں سے لکڑی اور کوئلے کا دھواں باہر نکلتا ہے۔

ہر آدرش! ایک پنجرہ ہوتا ہے جس میں آپ روح کا پنیر کھانے کے لئے ایک چوہے کی طرح اس سے باہر نہیں نکل سکتے---:

ہر کتاب اسپرین کی گولی ہوتی ہے۔ میں اپنے سر درد کو مٹانے کے لئے اتنی گولیاں کھا چکا ہوں کہ اب کسی گولی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

"عمر --؟ برسوں کے بکھرے راہوں کو کوئی مشکل سے طے کرتا ہے مشکلات کے پہاڑوں کو پار کرتا ہے' سماجی مسائل کے دریاؤں کو عبور کرتا ہے اور جب تھک ہار کر کسی منزل کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سپنے میں ہی چلتے چلتے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ پہنچا کہیں نہیں ہوتا---

تمہاری خود پسندی اس سانڈ کی طرح ہے۔ جس نے تمہارے من کی دھرتی کو اپنے سینگوں پر اٹھا رکھا ہے۔ جس کی بھوک مٹانے کے لئے تمہیں روز شہرت کا

چارہ ڈالنا پڑتا ہے۔

خودی سانپ کے اس زہر ایسی ہے' جس کو کوئی چالاک ایک بار نکال لے تو سانپ ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھ کا کھلونا بن جاتا ہے۔

"شادی بیاہ" ابھی تک دو انسانوں کو ایک دو سروں والا جانور ہی بنا سکی ہے اور کچھ نہیں۔

پرانی نسل نئی نسل کو اپنے قانون' اپنے وچار' اپنی روایات اور اپنے نظریے اس طرح دیتی ہے جس طرح کسی لاش کو جلانے کے لئے اس کا کفن اتار کر کوئی اچارجی کو بھینٹ کرتا ہے۔

میں جب کسی سیاستدان کو تقریر کرتے سنتا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے اس دن اس کی زبان کے لفظوں نے فینسی ڈریس پہنا ہوا ہے۔

دوستی؟ اس دنیا میں ہر ایک کو ایسے دوست کی تلاش ہوتی ہے۔ جو ایک قومی گیت کی طرح ہو۔ جس کی ہر ایک سطر تعریف کے ساتھ بھری ہوئی ہو۔ اور تم ایک قومی گیت کی طرح نہیں بن سکتے تو اس دنیا میں تمہاری دوستی کی کسی کو ضرورت نہیں۔

دھرتی ایک طوائف کی طرح چاند' سورج' ستاروں' بادلوں' ندیوں' دریاؤں اور عجیب و غریب پھول پتیوں کا شکار کر کے تمہارے جی کو موہ لیتی ہے لیکن وہ تمہیں پیار کبھی نہیں کرتی۔ اور جب وہ تمہاری جوانی تمہارے دل کی دولت تم سے چھین لیتی ہے تو تمہیں اپنے محلوں میں سے بڑی بے دردی سے نکال باہر کرتی ہے۔

اور اگر تم زندگی کو سچ مچ عشق کر بیٹھے ہو۔ اور اس کے عشق میں گیت لکھنے لگے ہو تو زندگی ایک روایتی معشوقہ کی طرح ہمیشہ پتھر دل بنی رہتی ہے کہ تمہارے عشق کا کبھی ہنگامہ نہیں بھرتی یا ایک مان متی ملکہ کی طرح تمہیں اپنے دروازے کا بھٹ یا بھانڈ سمجھ کر تھوڑی سی شہرت تمہیں خیرات کر دیتی ہے اور پھر تمہیں اپنے دروازے سے چلتا کرتی ہے۔ یہ ڈائری میں لکھنا نہیں چاہتا تھا' لیکن لکھ رہا ہوں۔

یہ سب کچھ میں اپنے گلے میں کپڑوں کی طرح پہنی ہوئی تھیں۔ جسے خاموشی کا پسینہ آتا رہا اور میرے کپڑوں کو بھگوتا رہا۔ لیکن آج جیسے میں ان کپڑوں کو سوکھنے ڈال رہا ہوں۔ ان کو لفظوں کی دھوپ کے سامنے لا رہا ہوں۔

اس ڈائری کو لکھ کر میں ہنسا بھی ہوں اور رویا بھی ہوں۔ ہنسا اس لئے ہوں کہ میں سب کچھ جان سکا ہوں اور رویا اس لئے کہ جب میں اس ڈائری پر اپنے دستخط کرنے لگا تو میں نے لکھ دیا "ایک بدنصیب کی ڈائری" میں سب کچھ جان سکا ہوں لیکن یہ نہیں جان سکا کہ میں سوم ناتھ لفظ کی جگہ بدنصیب لفظ کیوں لکھ دیا؟

آپ کو معلوم ہے کرامات کیا ہوتی ہے؟ کرامات وہ حادثہ ہے جو کسی کے خیال سے ایک انچ ادھر وقوع پذیر ہوتا ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ خیال کیا ہوتا ہے؟ خیال وہ چیز ہے جو کسی کو اصلیت سے ایک انچ آگے لے جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کرامات سے دو انچ کی دوری پر ہوں۔ بڑے سخت پاؤں سے اصلیت والی جگہ پہ کھڑا ہوں اور یہ میری بد نصیبی ہے۔ اگر میں چل کر ایک انچ آگے جا سکتا تو میں اپنے خیال کے زور سے بڑی خوبصورت ڈائری لکھ سکتا تھا۔ اور اگر میں اس سے بھی ایک انچ آگے جا سکتا تو کرامات دکھا کر اس دنیا کو بدل سکتا تھا۔ لیکن میں ان دو انچ کا کیا کروں جو مجھ سے چلے نہیں گئے۔

دوسری بار

نائن زیروٹو---- ٹیلیفون کا یہ نمبر رات سے ڈاکٹر روی کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

معلوم نہیں کہ اسی طرح دوسری طرف بھی آواز پہنچی ہے کہ نہیں؟ باہر رات ابھی باقی تھی جب اسے ایک اداس سی ہنسی آئی۔

دن چڑھے جب اس نے نمبر ڈائل کیا' تو مس اڑوڑا کی جگہ کوشی' لفظ اس کے ہونٹوں پر آگیا۔ ڈاکٹر روی کے ہونٹ کانپ گئے۔

چالیس برس گزر چکے ہیں۔ جب اس نے بڑی شدت کے ساتھ اس نام کو دل کی مٹھی میں بند کیا تھا یہ اس کے اپنے ساتھ کیا ہوا اس کا اپنا وعدہ تھا۔ اسی کا خیال تھا کہ اس نے جہاں کئی بار اس نام کو دھرایا تھا۔ وہ چپ چاپ ہمیشہ وہیں پڑا رہا۔ لیکن آج جب اس نے فون ڈائل کیا تو اسے محسوس ہوا یہ نام اس کے اندر چالیس برس سے چل رہا تھا۔ اور آج اس کے دل کی مٹھی میں سے آہستہ آہستہ سرکتا ہوا اس کے ہونٹوں تک آگیا ہے"

دوسری طرف سے حیران سی آواز سنائی دی "کون؟"

"میں روی----"

"کون روی؟" لمحے کے لئے جیسے اس کا اپنا کوئی وجود رہا ہو نہ کوئی شناخت۔ ڈاکٹر روی نے ایک گہرا سانس بھرا۔ اپنی پہچان کی تلاش کرتے ہوئے کہا "دہلی والے پرنسپل سورج بھان جی کا لڑکا"

دوسری طرف سے ایک خاموشی تھی۔ ڈاکٹر روی کو یقین آگیا کہ وہ پہچان کی

خاموشی تھی' اور اس خاموشی کا کچھ دیر کے لئے بھرت جانا' عام سی بات تھی۔
خاموشی کو توڑنے کے لئے بے معنی سا سوال کیا "پہچان لیا ہے؟"
سرگوشی ہوئی "ہاں"
گوشی! اگر میں تمہیں کسی دن بلاؤں---- میرا مطلب ہے' مسٹر اڈوڑا کو بھی تو آجائیں گے؟
"انہیں فون کر لیں---- نہیں----
ڈاکٹر روی نے گوشی کے "انہیں" کو فون کیا۔ اگرچہ ایک دن پہلے ایک دوست کے ہاں' ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ لیکن اپنے ملک سے لاکھوں میل دور ایک ملک میں اتنی سی ملاقات بھی کسی کو دعوت پر بلانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ مسٹر اڈوڑا نے ڈاکٹر روی کی دعوت قبول کر لی۔
ڈاکٹر روی جوانی میں ایک بار لندن آیا تھا۔ اور اسے اپنا مستقبل لندن میں دکھائی دیا تو وہ لوٹ کر اپنے ملک نہیں آیا۔ اس نے شادی بھی یہاں کی ایک لڑکی کے ساتھ کر لی اور ڈھیروں روپیہ بھی اسی سرزمین سے کمایا لیکن آج مستقبل کی طرف دیکھنے کی بجائے وہ چالیس برس پیچھے ماضی کی طرف دیکھ رہا تھا۔
بیس برس کا روی اور بمشکل اٹھارہ برس کی گوشی۔ روی کے پاؤں میں ایک پہاڑ بچھا ہوا تھا۔ روی کے باپ سورج بھان جی گوشی کو پڑھاتے ہوئے' گوشی ایسی مندر کی مورتی کے لئے ایک دیوتا بن گئے۔ گوشی ایک دیوداسی کی طرح مندر کے لئے وقف کی ہوئی چیز ہوگئی تھی۔ اور روی مندر کی دہلیز کی طرح جہاں کھڑا تھا' وہی کھڑا ہی رہ گیا۔
گوشی جب پڑھنے کے لئے آتی تھی۔ روی کو اپنے باپ کے کمرے کی آواز یوں سنائی دیتی جیسے مندر کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ جب کبھی گوشی کی آواز سنائی دیتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ایک داسی کے پاؤں کے گھنگھرو چھنک پڑے ہوں۔
کبھی کبھی یہ افواہ بھی سنائی دیتی جیسے کسی مندر کو محمد غوری کے آنے کی خبر ملی ہو---- اور یہ ہتھوڑوں کی ضرب سے ٹوٹنے کے خوف سے مندر کے بتوں میں

سے ایک کپکی سی گزر گئی ہو----

روی کے لئے ممکن اور ناممکن کے معنی بدل گئے- جہاں جس جگہ اس کے بوڑھے باپ کے ہونٹوں کے بول پہنچ رہے تھے- وہاں اسی جگہ اس کی جوانی کی باہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں-

پھر یہ باہیں آپ ہی تھام لی تھیں- وہ اپنے باپ کی آنکھوں میں محمد غوری نہیں بن سکتا تھا- پھر آہستہ آہستہ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اپنی ساری تڑپ اس نے اپنے باپ کے سینے میں ڈال دی ہو- اور خود اس سے خالی اور سرخرو ہوگیا ہو-

وہ مطمئن اور اداس یہاں لندن میں آگیا پھر یہ خبریں اسے کتنی دیر کے بعد اخبار کی خبروں کی طرح معلوم ہوئی تھیں کہ کوشیلا کی شادی کسی مسٹر اروڑا کے ساتھ ہوگئی ہے اور اس کے باپ چند ماہ میں ہی لقوہ کی بیماری سے فوت ہوگئے تھے

ڈاکٹر روی کی زندگی مستقبل کی طرف ایک میانہ روی سے چل رہی تھی اس نے ڈگری حاصل کر لی اور ایک انگریز لڑکی سے بیاہ رچالیا- ہر برس یورپ کے کسی نہ کسی حصے کی سیر کی تھی- دو بیٹوں کو جنم دیا' پالا پوسا کھلایا پڑھایا تھا- لیکن آج ایک لفظ "کوشی" جب اس کے ہونٹوں پر آیا تو اسے محسوس ہوا- یہ لفظ چالیس برس اس کے اندر پڑا ہوا اس کے ہونٹوں تک پہنچنے کا سفر طے کر رہا تھا-

جیسے گلیشیر اتنی ست رفتار سے چلتا ہے کہ اس کی چال دیکھی نہیں جا سکتی- اچانک ڈاکٹر روی کی انگلیوں میں تپش سی آگئی' اور ساتھ ہی ایک عجیب سا احساس کہ اس کی زندگی کی تمام کمائی سبز درختوں کی طرح تھی- جن کی چھاؤں میں وہ عمر کے چالیس برس چلتا رہا تھا اور اس کے بدن کو چالیس برس سے ایک ہی فکر لاحق تھی----

کوشی کی اپنی ایک دھوپ تھی---- جس میں ڈاکٹر روی نے اسے دیکھا تھا وہی دھوپ---- صرف وہی دھوپ---- آج پھر آسمان پر چڑھی ہوئی تھی- اور ڈاکٹر روی کے بدن کا بال بال اس دھوپ سے کھلا اور کھلا پڑا تھا-

روی کے انگریز بیوی نے دعوت کی میز کو سجایا- مہنگے پھل خریدے' میز پر

سلک کے شیٹز بچھائے' میڈ سے چینی پکوان' ازبیک پلاؤ اور روسی سلاد بنوایا۔ گزشتہ دنوں ایک جار جیسین سے جو اس نے پنیر کی روٹی بنانا سیکھی تھی۔ وہ روٹی اس نے اپنے ہاتھوں سے خود بنائی۔

ڈاکٹر روی کسی بھی دعوت کے لئے اتنا اہتمام نہیں کرتا تھا۔ اس نے پیرس سے لایا ہوا سوٹ پہنا' موسیقی کے احتیاط سے رکھے ریکارڈ نکالے میتھورنا کی سینفنی' روی شنکر کی ستارا' اور چیکو سلواکیہ کا بیلے سنگیت-----

دوپہر آہستہ آہستہ شام میں بدل رہی تھی۔ ڈاکٹر روی کے بدن پر جو دھوپ چڑھی ہوئی تھی اسی طرح اس کے اعضاء کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی تن پر پہنے ہوئے کپڑوں کی طرح جیسے اسے اس دھوپ نے ڈھانپ رکھا ہو اوڑھ رکھا ہو-----

دو تین بار اس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ اور یقین ہوگیا کہ اس نے اپنی دھوپ سچ مچ اپنی بیوی سے چھپالی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اس کے بدن میں سے ایک لکیر سی کھچ گئی ایک دھوپ شاید کوشی کی آنکھوں سے بھی چھپی رہے گی؟

نہیں----- دھوپ' دھوپ کو پہچان لے گی۔ اس نے اپنی سوچ کو لوٹا دیا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں چمک آجائے گی اسے آواز دیتے ہوئے میرے گلے میں چمک پڑے گی۔ یہاں دور دھرتی پر اس کے ساتھ ہاتھ ملانا ممکن ہوگا۔ اس دھوپ کی گرمی میرے ہاتھوں کی انگلیوں میں آجائے گی-----؟

ڈاکٹر روی کو اپنے ہاتھ کی انگلیاں تپنے کی بجائے ٹھنڈی ہوتی محسوس ہوئیں اور وہ گھبرا کر اندر غسلخانے کے بڑے آئینے کے سامنے جاکھڑا ہوا۔

کوشی کا چہرہ----- چالیس برس پہلے جو اس نے دیکھا تھا---- اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی چہرہ تھا۔ دبلا پتلا اور اپنے روپ سے آپ ہی شرمندہ' خاموش لب' لیکن نچلا ہونٹ کبھی کبھی کانپ کر اوپر کے ہونٹ کو چھو لیتا۔ سیدھی مانگ نکالے ہوئے بال جو کبھی کبھی بہک کر اس کی چٹیا کے بل سے باغی ہو جاتے۔

کوشی ابھی دور تھی لیکن اس وقت دیوار کے آئینے میں ڈاکٹر روی کا اپنا چہرہ ایسے لگا جیسے اس نے برسوں کے بعد اچانک دیکھا ہو۔ بالکل اس کے باپ سورج

بھان جی کا چہرہ گورا' کتابی ماتھے پر ڈھلکتے چاندی کی تاروں ایسے بال' چہرے کا گوشت لٹکا ہوا' لیکن آنکھوں میں ایک جوان سی چمکتی ہوئی پریشانی۔

اف خدایا---- ڈاکٹر روی کو محسوس ہوا کہ اس کا سارا وجود اپنے باپ کا وجود بن چکا ہے۔ وہی تڑپ جو اسے کبھی محسوس ہوا تھا کہ اس کے باپ نے اسے سونپ دی تھی۔ آج اس کے باپ نے واپس اسے لوٹا دی ہے۔

نہیں---- اسے ایک خوف ایسا احساس ہوا کہ آج اس کے باپ نے اس کا وجود چھین لیا ہے۔ اور چالیس برسوں کے بعد کوشی کو دیکھنے کے لئے وہ ڈاکٹر روی کو اپنے راہ میں سے ہٹا کر اس کی جگہ آکھڑا ہوا ہے۔

وہی عمر---- کھلا گورا ماتھا۔ ماتھے پر ڈھلکتے چاندی کی تاروں ایسے بال۔ چہرے کا گوشت لٹکا ہوا لیکن آنکھوں میں ایک چمکتی ہوئی جوان پریشانی۔

آج ڈاکٹر روی جیسے آپ اپنا باپ بن گیا تھا---- اس نے پریشان ماتھے پر آئے پسینے کو پونچھنے کے لئے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا۔ لیکن وہ ہاتھ نڈھال سا تھا۔ جیسے اس کے باپ کا نیم بے جان سا بدن آج دوسری بار اس کے اپنے بدن میں بھی بے جان ہو رہا تھا----

کیلے کا چھلکا

اصل میں مجھے یہ کہانی نہیں لکھنا تھی۔ صرف ایک تار بھیجنا تھا۔ رپی نے آخری وقت میں مجھ پر ایک تار بھیجنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ اس کی زندگی کی شمع پوچھو تو بجھ گئی تھی۔ ذمہ داری لیتے وقت مجھے یہ خیال ہی نہ تھا۔ تار میں لکھنے والی بات اس نے مجھے بتا دی تھی وہ صرف یہ تھی۔

" تیری چال صحیح نکلی تجھے مبارک ہو" لیکن تار کسے بھیجنا تھا۔ یہ رپی نے مجھے بتایا ہی نہ تھا۔ کہ یکایک اس کی زندگی کی شمع گل ہو گئی۔ رپی تو جینے کے لئے تھی لیکن اس کی زندگی کیا کہوں جو تیرا بوجھ نہ اٹھا سکی ایک دفعہ میں نے ایک نظم لکھی تھی جس کا شعر یہ تھا

ع ہم زندگی کی مہمان نوازی دیکھ چکے ہیں
موت بھی بہت بلا رہی ہے
چلو اسے بھی چل کر دیکھ لیں

اور میری پیاری رپی مجھے لگتا ہے کہ یہ بات اتنی مجھ پر نہیں لگتی جتنی تجھ پر۔ سچ پوچھو یہ زندگی تیری مہمان نوازی بھول گئی۔

آج اگر تو کہیں دیکھ سکتی ہے تو دیکھ رپی۔ میں تجھ سے کیا ہوا وعدہ تار کے ذریعے پورا نہیں کر رہی ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے لیکن تیری کہانی لکھ کر یہ وعدہ پورا کر سکتی ہوں۔

رپی کا پورا نام بہت بڑا تھا۔ میں نے اس کے نام کو مختصر کر کے صرف "رپی" کر دیا تھا۔

اوراس نے بھی دوستی کے اس ناتے سے میرا نام مختصر کر دیا تھا۔ اور مجھے "ایی" کہہ کر پکارتی تھی۔

اسے میرے گیتوں سے پیار تھا اور مجھے اس کی آواز سے۔ جب وہ گاتی تھی تو مجھے لگتا تھا میرے گیتوں کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ صرف میرے ہی نہیں بلکہ جس کے بھی وہ گیت گاتی تھی اسے یہ محسوس ہوتا تھا گیتوں کو جلا دینے کے لئے رپی کے پاس آواز کی ایسی دولت تھی۔ جگہ جگہ وہ اس دولت کو لٹاتی تھی اس کی دولت پھر بھی بڑھ جاتی تھی۔ وہ جس وقت اسٹوڈیو میں گانے کے لئے جاتی تھی تو سازندے فخر سے پھول جاتے تھے۔ بے سرے گانے والوں کے بے سرے گیتوں کے ساز بجا بجا کر وہ تھک چکے تھے۔ لیکن جب رپی جیسا سریلا کلاکار آتا تو ان میں نئے سرے سے جان پڑجاتی۔

رپی کے جوان چہرے پر ایک بزرگانہ انداز ہوتا تھا مجھے یاد ہے رپی کو دیکھ کر ایک مداح افسر نے کہا تھا۔

"پیر پڑتا ہوں۔"

اور رپی فخریہ آمیز لہجہ میں جواب دیتی تھی "جیتے رہو خدا کرے۔"

ایک دفعہ میں مزاحیہ ادب کے مشہور ادیب ہری چند اختر اور رپی کے ساتھ سٹوڈیو سے باہر آرہی تھی۔ دوسرے دن اتوار تھا اور رپی کی چھٹی تھی۔ مداح افسر اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"اگلے پیر تک پاؤں پڑتا ہوں۔ تب رپی نے اس سے کہا۔ پیر تک جیتے رہو۔"

مجھے یاد ہے پنڈت ہری چند اس جواب پر اصل میں دیوانہ ہوگیا تھا اور اس کے بعد جب ہم آپس میں ملتے تو وہ رپی کے اس جواب پر ہنس پڑتے تھے۔

آفس کی ڈیوٹی ختم ہونے کے اکثر کئی دفعہ ہمیں آفس کی بس مل جاتی تھی جس میں ہمارے ساتھ رپی کو بھی چلنا پڑتا تھا ہم میں بہت سوں کو اس کے ساتھ کچھ وقت گزانے کی خواہش تھی ہر دفعہ اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی ایسی بات نکل

جاتی تھی جو ہم میں سے بہت سوں کی شام کو رنگین کر دیتی تھی۔

ایک دفعہ ایک چوک میں گائے بیٹھی تھی۔ ڈرائیور ہارن بجاتے بجاتے تھک گیا تھا۔ لیکن گائے نہ ہٹی۔ رپی ہنس کر کہنے لگی۔ "آج کوئی سپاہی اپنے بدلے اس گائے کو ڈیوٹی پر بیٹھا گیا ہے۔

ایک دفعہ ایک سائیکل والا بس کے آگے آگے سائیکل چلا رہا تھا۔ ہارن بجنے پر بھی وہ ایک طرف نہ ہوا۔ رپی نے ہنس کا کہا۔

ارے یہ تو ایک پیرامریکہ میں اور دوسرا ہندوستان میں رکھتا ہے۔"

رپی کا دل بھی ایسا نازک تھا ایک دفعہ وہ ڈرائیونگ سیکھنے لگی جب اس نے دائیں جانب موٹر کو موڑا تو سامنے سے ایک سائیکل والا آکر اس کی موٹر سے ٹکرا گیا۔ دھکا لگنے سے سائیکل والا بے ہوش ہوگیا۔ فلائنگ اسکواڈ والے اسے لے کر لے گئے۔ رپی کی زبان سے صرف اتنا نکلا۔ "اس کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میرے ہاتھوں نے کبھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا" کچھ بھی نہیں ہوا۔

لیکن تقریباً دو سال ہوئے رپی کے فن کو' اس کے خوبصورت چہرے کو اور شخصیت کو پیار کرنے والوں نے سچے دیکھا کہ رپی بیمار ہونے لگی ہے جب وہ ملتی تھی اس کا چہرہ پہلے سے کمزور نظر آتا تھا۔ پہلے جو تازگی اس کے چہرے پر نظر آتی تھی اس کی جگہ پر اب دبی دبی غم کی پرچھائیں نظر آنے لگی تھی اور زندگی کا سارا رنگ غائب ہوتے ہوتے ایک دن ایسا بھی آیا جب اس کے گھر والوں نے اسے صفدر جنگ ہسپتال میں لے جاکر داخل کرا دیا۔

پچھلے مہینے ہم آفس کے کتنے ہی آدمی اس کی خیر و عافیت پوچھنے گئے۔ ڈاکٹر اس کے ایکسرے کی رپورٹ لئے ہوئے آیا تھا۔ رپی کے ہونٹ جیسے کہہ رہے تھے۔"

"ہڈیاں تو سلامت ہیں نا ڈاکٹر؟ اچھی طرح دیکھو ایک آدھ ٹوٹی ضرور ہوگی۔"

پچھلے ہفتے میں اکیلی اس کے پاس تھی۔ اور اسے اپنا تازہ گیت سنایا تھا جو کچھ

ایسا تھا۔

پر کاش کی پھلواری
ٹانکا کوئی نہ لگائے

گیت سن کر رپی رونے لگی۔ کہنے لگی۔ میں جب بھی تیرا نیا گیت سنتی ہوں ایمی..... میرے گلے میں سر تھرتھرانے لگتے ہیں۔ کسی دوسرے کے لئے تو نہیں۔ کاش میں تیری مسرتوں کی پھلواری میں ٹانکا لگانے کے لئے زندہ رہ سکوں!"

تجھے ان گیتوں کی قسم رپی۔ ایک دفعہ صرف ایک دفعہ بتا دے' تجھے کیا دکھ ہے؟ تیرے ایک ایک عضو کا معائنہ ہوچکا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہے۔ کسی کو بھی کوئی روگ نظر آتا۔

نہیں" ایمی مجھے گیتوں کی قسم نہ دے یہ میرے ساتھ کچھ ایسا نہ ہوگا۔"

رپی قسم نہ سہی میرے گیتوں کی منت ہی سہی۔ ان سب کی جو نے گائے ہیں اور ان کی بھی جو ابھی تجھے گانے ہیں۔"

"ایمی تجھے سچ بتاؤں..... دو سال ہوئے میں کیلے کے چھلکے پر سے گر گئی تھی اتنا کہہ کر رپی اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگی۔

"چل پاگل!"

"سچ..... کسی وقت معمولی چوٹ گہرا داغ دے کر چھوڑتی ہے۔

"اور تجھے کس ہڈی پر چوٹ لگی۔؟"

"ہڈی پر تو کوئی نہیں لگی ہے۔ لیکن بہت کچھ ٹوٹ چکا ہے میرا دل ٹوٹ چکا ہے۔"

"رپی...."

وہ کیلے کا چھلکا نہیں تھا..... ایک لڑکی تھی۔"

"لڑکی------ آخر کون لڑکی تیرے راستے میں آسکتی ہے رپی؟"

وہ میرے راستے میں آئی------ یا میں اس کے راستے میں آگئی؟ مجھ سے کہا گیا کہ میں خود اس کے راستے سے ہٹ جاؤں۔"

"کیا کہہ رہی ہوں رپی۔؟"

خود پر یقین رکھتی ہوں اس لئے دوسروں پر بھی مجھے اعتماد کم نہیں ہے۔ مجھے اس پر بھی اعتماد تھا۔ اس نے مجھے خط لکھا کہ کسی آدمی نے میرا خراب قسم کا فوٹو کھینچا ہے۔ رشوت میں وہ آدمی دو سو روپیہ مانگتا ہے نہ دینے کی حالت میں وہ اس فوٹو کو میرے گھر والوں کو دکھا دے گا۔"

"پھر؟"

روپے تو میں نہیں دیئے۔ لیکن اندر ہی اندر غم کھانے لگی۔ سوچنے لگی۔ آخر وہ فوٹو کھینچا کس نے؟.... اور کیسے کھینچا؟

میں نے گھر والوں کو بھی یہ بات بتائی ایک تو مجھے یقین تھا کہ اس قسم کا فوٹو کسی کے پاس نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر کہیں کسی نے شرارت سے میرا سر کسی ننگے جسم سے جوڑ کر فوٹو کھینچا ہوگا تو یہ بات بھی فوٹو دیکھنے کے بعد ظاہر ہو جائے گی۔ میں عجیب پریشانی میں گھر گئی۔؟

سچ ایمی' دن میں تین دفعہ ڈاک آتی تھی۔ جب بھی کوئی نیا لفافہ دیکھتی تھی تو میرا ہاتھ کانپنے لگتا تھا۔۔۔۔۔ جس سے میں پیار کرتی تھی اسے بھی میں نے یہ بات بتائی مجھے یقین تھا کہ وہ میری سچائی پر کوئی گمان نہ کرے گا۔ لیکن کوئی شام ایسی نہ گزرتی تھی جب ان فوٹو کا ذکر نہ نکلتا ہو۔ اس کی باتیں بھی دوسروں کی سی بن گئی تھیں۔ وہ کہتا تھا کچھ تو بات ہے.... جو یہ بات ہوئی ہے!..... ایمی پانی دے۔

میں نے پانی رپی کو پلایا۔۔۔۔۔ اور اس کے ہاتھ کو پیار سے دبا دیا۔

"میرے ہاتھ کو اس طرح پیار سے..... ایمی اس طرح دبانے سے دل میں کتنی ہی باتیں نکل آتی ہیں۔" میں بیمار ہوگئی۔ اس کے بعد وہ اکثر میرے پاس آتی تھی مجھے بہت بھاتی تھی۔ ڈاکٹر سے پوچھ گچھ کرتی اور چلی جاتی تھی۔"

اس طرح میرے ہاتھ کو دبا کر سکون دیتی تھی اور اب جو بھی کوئی اس طرح پیار سے ہاتھ دباتا ہے تو جیسے جسم میں خنجر چبھنے لگتے ہیں۔"

"اور اس طرح دو سال تک تجھے ستاتی رہی؟"

"ہاں ایمی..... جیسے جیسے میں بیمار ہوتی گئی- خط کے ذریعے اس کی دھمکیاں بڑھتی گئیں اس کا خیال تھا کہ اس دن میں میں ضرور مرجاؤں گی..... کسی کو مارنے کا کتنا آسان راستہ ہے ایمی سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے- مرنے کا کوئی دکھ نہیں ہوتا ایمی..... لیکن اس کی نظروں میں مرجانا جسے کوئی پیار کرتا ہو..... اف....

ہاں ایمی..... تقریباً چار ہفتے ہوئے ایک بات کی مجھے خوشی ہے کہ میں سب کی نظروں میں سرخرو ہو کر مر رہی ہوں اپنی نظروں میں سرخرو ہو کر مر رہی ہوں- اپنی نظروں میں تو شروع ہی سے سچی تھی- لیکن یہ پچھلے دو سال جس طرح میں نے کاٹے ہیں جسے پیار کیا..... اسے بھی دل سے نکال چھوڑا اور اس عرصہ میں نے موت کے لئے جتنی دعائیں مانگی ہیں یہ دعائیں قبول ہو چکی ہیں ایمی..... اب مجھے جینے کی خواہش نہیں-

"لیکن رپی تجھے مار کر کسی کو کیا ملنا تھا؟"

"تو تو عورت ہے ایمی..... عورت ہو کر بھی تو یہ بات پوچھتی ہے؟"

اس کی بات سن کر میں نے انگلی دانتوں میں دے لی- میں صرف اتنا ہی کہہ سکی- "عورت کا روپ میں نے کہیں نہیں دیکھا پیاری رپی!"

"میرے لئے یہ بات غنیمت ہے کہ میں مرنے سے پہلے سرخرو ہو چکی ہوں-"

"لیکن تجھے یہ راز کیسے معلوم ہوگیا؟ چال تو ایسی تھی جسے کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا-"

"یہ بھی ایک جیسی بات ہے پندرہ نئے پیسوں کی بچت نے سب کچھ کھول دیا-"

اس نے خط لکھ کر مجھ سے خیر و عافیت پوچھی- لفافے کے ایک طرف میرا پتہ لکھ کر کاٹا گیا تھا..... اور پھر اسے نئے سرے سے لکھا گیا تھا- میں سمجھ نہ سکی کہ پتہ کاٹ کر دوبارہ کیوں لکھا گیا ہے؟"

"پھر دھیان سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پہلا کاٹا ہوا پتہ کسی دوسرے کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ اور تجھے بتاتے عجیب سا لگتا ہے ایمی..... کہ وہ لکھائی ہو بہو اس دھمکی والے خط کی سی تھی۔"

"اف میرے خدایا.....! تو کیا یہ سب شرارت تیری اس سہیلی کی تھی؟"

"میں نے خط لکھ کر اسے اپنے پاس بلایا..... اور پھر جب میں نے پولیس کی دھمکی دی تو اس نے پولیس کے خوف سے وہ سب کچھ بتا دیا..... بات دراصل یہ تھی کہ وہ بھی اس سے پیار کرتی تھی جسے میں چاہتی تھی مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے یہ چال چلی تھی۔

رپی..... رپی..... تو نہیں مرسکتی..... جس نے آگ لگائی ہے اس کو اس آگ میں جلنے دے تو زندہ رہے گی..... رپی..... تو جیئے گی..... اپنے فن کے لئے ..... میرے گیتوں کے لئے؟"

نہیں ایمی..... اب بہت دیر ہو چکی ہے اب مجھے مرنے کا کوئی غم نہیں دو سال سے جو میری زندگی کی روح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اب جب میں بھی ختم ہو جائے تو مجھے اس کا کوئی ملال نہیں ہاں..... ایمی..... تو ایک کام کر.....

میں مرجاؤں تو اسے تار دے دینا کہ تیری چال صحیح نکلی۔ تجھے مبارک ہو۔"

اس دن جب میں بھیگی پلکوں سے رپی کے پاس آئی تو مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس رات اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔"

جس لڑکی نے یہ چال کھیلی تھی اس کو بھی رپی کی موت کی خبر پہنچ چکی ہوگی اور کیوں کہ مجھے اس کا نام اور پتہ معلوم نہیں۔ اس لئے میں اسے تار نہیں دے سکتی۔ لیکن اس کے بدلے..... صدق دل سے میں یہ کہانی لکھ کر اپنا فرض پورا کر رہی ہوں۔ کہ کہیں رپی کی طرح کوئی معصوم لڑکی کیلے کے چھلکے پر سے گر نہ جائے۔

تخلیق

روی نے ابھی ابھی ایک نظم لکھنا شروع کی تھی لکڑ منڈی سے کالے ٹوپ کو جاتی ہوئی پگڈنڈی پر چڑھتے ہوئے اس نے پہاڑ کی ہریالی کو گھونٹ گھونٹ پیا تھا۔ اوک بھر بھر کے پیا تھا۔ اور منہ لگا کے پیا تھا اور پھر کئی میلوں کی چڑھائی طے کرنے کے بعد ڈاک بنگلے میں پہنچ کے جب اس نے سامان رکھا۔ اس کی بیوی نے اس کے لئے گرم کافی بنائی اور اس کے آرام کرنے کے لئے پلنگ پر بستر بچھایا تو اس کو محسوس ہوا کہ وہ ابھی سو نہیں سکتا۔ وہ ڈاک بنگلے سے اکیلا باہر آگیا ..... اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جس ہریالی کو اس نے گھونٹ گھونٹ پیا تھا اور اوک بھر بھر کر پیا تھا اور منہ لگا کے پیا تھا' اس کو جذب کر پانا بہت مشکل ہے وہ کاغذ لے کر نظم لکھنے لگا اور نظم لکھتے لکھتے اسے محسوس ہوا کہ وہ ہریالی کے تیکھے نشے کو توڑنے کے لئے ایک "اینٹی ڈوز" لے رہا ہے۔

کاغذ پر لکھی ہوئی ادھوری نظم کو اس نے گھاس پر رکھ دیا۔ نظم ابھی پوری نہیں ہوئی تھی ایک چھوٹا سا پتھر کا ٹکڑا اس نے کاغذ پر رکھ دیا اور خود گھاس پر لیٹ گیا۔ اسے "سارتر" کی کہی ہوئی ایک بات یاد آنے لگی۔ "میں جب لکھتا ہوں مایوسی کے جال میں ایک خوبصورتی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں" اور روی نے محسوس کیا کہ وہ جب بھی نظم لکھتا ہے مایوسی کے جال میں خوبصورتی کو نہیں پکڑتا۔ بلکہ خوب صورتی کے جال میں مایوسی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

اور پھر روی نے اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا۔ اس میں مایوسی یا ناامیدی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ لیکن کاغذ پر لکھی ہوئی نظم میں مایوسی اور نا

امیدی تھی۔ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ قبروں کی رکھوالی کے لئے بیٹھا ہوا ہے اس کی محبت کب کی مرچکی تھی محبت کا درد بھی مرچکا تھا۔ وہ اس لڑکی کو نہیں پا سکا تھا' جسے اس نے کبھی پانا چاہا تھا لیکن وہ جب بھی نظم لکھتا تھا تو نظم میں ایک خاموش درد نہاں ہوتا ہے۔ لیکن اس درد کو درد نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ درد زندہ نہیں تھا اور اسی لئے روی آج سوچ رہا تھا کہ اس کے اندر کا وہ روی جو نظمیں لکھتا تھا۔ قبروں کی رکھوالی کے لئے بیٹھا ہوا ہے۔

روی کو پھر سارتر یاد آیا سارتر نے اپنے متعلق کہا تھا کہ ہاتھ میں کاغذ لے کر صبح کچھ نہ کچھ لکھنے کی اس کی دیوانگی ایسی تھی جیسے وہ اپنے زندہ ہونے کے قصور کی معافی مانگتا ہو روی نے محسوس کیا کہ بات سچی تھی۔ کیونکہ اس نے آج تک جو کچھ بھی لکھا تھا' کبھی اس لڑکی کو پڑھوانا نہیں چاہا تھا جس کا وہ اپنی نظموں میں ذکر کیا کرتا تھا اور نہ ہی اس نے اپنی نظموں سے شہرت خریدنا چاہی تھی۔ "شہرت" کے بارے میں بھی اس کے خیالات سارتر سے میل کھاتے تھے کہ شہرت تب آتی ہے۔ جب انسان مرچکا ہوتا ہے وہ اس کی قبر سجانے کے لئے آئی ہے اور اگر کبھی پہلے آ جائے' انسان کے جیتے جی آجائے تو وہ پہلے انسان کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرتی ہے پھر اس کی قبر کو سجاتی ہے.... روی نے اپنی نظموں کو کبھی انعامی مقابلوں میں نہیں بھیجا تھا۔ یہ اسے یوں لگتا تھا جیسے کچھ امیر لوگ اپنی دولت کے زور پر یا عہدوں کے زور پر فنکاروں کو بیڑوں کی طرح لڑا کے دیکھتے ہوں اور پھر ایک دوسرے کو لہولہان کرکے جو جیت جاتا ہے اس کا جلوس نکالتے ہیں..... اور روی کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ لکھتا تھا نہ کسی محبوب کے لئے لکھتا تھا۔ نہ کسی شہرت و عزت کی خاطر جیسے وہ کھانا کھاتا تھا کہ زندہ رہ سکے' اسی طرح وہ نظمیں لکھتا تھا۔ کہ وہ زندہ رہنے کے قصور کی معافی مانگ سکے۔

اور پھر روی کو ایک بہت غلیظ سا خیال آیا کہ نظمیں کیچوے ہوتی ہیں کیچوے دھرتی کی جلن سے پیدا ہوتے ہیں اور نظمیں دل کی تپش سے! اصل میں روی کو اپنا خیال غلیظ نہیں لگتا تھا اسے ایک کیچوے کی پلپلی اور لیسلی شکل یاد آگئی

تھی' اور نظم کو کیچوے سے تشبیہ دیتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے خیال کا جسم بھی کیچوے کی طرح چپ چپ کر رہا ہے لیکن بات سچی ہے۔" روی نے سوچا اور ہنسنے لگا۔

پھر روی کو خیال آیا کہ ہر نظم خاموشی کی اولاد ہوتی ہے۔ جب انسان ایک سے اتنا گونگا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں بول پاتا ہے تو اسے اپنی خاموشی سے گھبرا کے نظم لکھنا پڑتی ہے۔

پھر روی کو خیال آیا کہ نظم لکھنا خدا کے باغ سے سیب چرانے کے برابر ہے۔ آدم نے سیب چرایا تھا تو اسے باغ سے ہمیشہ کے لئے باہر نکال دیا گیا تھا اور اسی طرح جو انسان نظم لکھتا ہے اس کے دل کا کچھ حصہ خواہ اس دنیا میں رہتا ہے لیکن کچھ حصہ بہرحال ہمیشہ کے لئے جلاوطن ہو جاتا ہے اور جلاوطن ہوتے ہوتے دل کا اس دنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہتا۔

"پر نہیں" روی نے سوچا "دل کے ان دونوں ٹکڑوں کا ایک دوسرے کے ساتھ نفرت کا واسطہ رہتا ہے دونوں شاید ایک دوسرے پر رشک کرتے ہیں۔ اسی لئے ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور اسی مسلسل نفرت میں ایک خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے نظمیں اس جنگ میں ہتھیاروں کا کام کرتی ہیں۔ عجیب بات ہے ..... "روی نے آگے اور سوچا" نظمیں ہی اس خانہ جنگی کا سبب بنتی ہیں۔ نظمیں ہی اس کا ہتھیار بنتی ہیں۔ روی کو ایک غمناک ہنسی نے گھیر لیا۔ "اور نظمیں ہی شاید اس خانہ جنگی میں آئے زخموں کا مرہم بنتی ہیں۔"

اور نظموں کے اتنے روپ اختیار کر لینے کی طاقت پر روی کو نظموں کی وسعت اور عظمت کا خیال آیا۔ "انسان اس زمین پر کتنی تھوڑی جگہ گھیر پاتا ہے۔ اس کے گرد اس کے ماحول کی وردی اتنی کسی ہوئی ہوتی ہے کہ وہ دل کھول کے ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتا لیکن اسکی نظم اتنی وسیع ہوتی ہے' وہ اتنی جگہ گھیر سکتی ہے کہ وہ بیک وقت اپنا ایک پیر انسان کے پالنے میں رکھ سکتی ہے اور ایک پیر انسان کی قبر پر!"

خیالات کی ایک ندی سی بہتی جا رہی تھی۔ ندی میں برساتی پانی کا سیلاب نہیں تھا۔ یہ دونوں کناروں کی روایت کو قبول کئے چپ چاپ بہتی جا رہی تھی اور روی اس کے پانی میں بڑے سکون سے تیر رہا تھا۔

"ویر جی! آپ کا کاغذ ہوا میں اڑ کے بہت دور چلا گیا تھا۔ آپ کو پتہ بھی نہیں چلا۔" مونا نے روی کے قریب آکر کہا اور کاغذ روی کے ہاتھ کے پاس رکھ دیا۔ ہوا تیز چلنے لگی تھی مونا نے کاغذ پر رکھنے کے لئے آس پاس کوئی پتھر ڈھونڈنا چاہا لیکن قریب پڑا ہوا پتھر کا ٹکڑا بہت چھوٹا تھا وہ کاغذ کو روک نہیں سکتا تھا۔ مونا نے کاغذ کو اڑنے سے بچانے کے لئے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

روی نے شام کے نرم دھندلکے میں پہلے کاغذ کی طرف دیکھا' پھر کاغذ کے اوپر رکھے ہوئے مونا کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ پتلا اور بہت گورا ہاتھ تھا۔ روی کو لگا کہ یہ ہاتھ ایک پیپر ویٹ ہے اس ہاتھ کو باقی جسم سے الگ کر کے ایک پیپر ویٹ کی طرح میز پر رکھنے کا خیال روی کو بہت اچھا لگا۔ روی کا خیال آیا ایک دن اسکی بیوی نے اس کے کوٹ کو اپنے شانوں پر ڈال لیا تھا' تو اسے خیال آیا تھا۔ کہ وہ کتنا خوبصورت کوٹ ہینگر ہے ..... روی کو حیرت ہوئی کہ جیتے جاگتے انسانی اعضا کو وہ ہمیشہ بے جان چیزوں کی شکل میں کیوں یاد کرتا ہے؟ سڈول گورے اور تنے ہوئے کندھوں کو دیکھ کر اسے کوٹ ہینگر کا خیال کیوں آتا ہے؟ اور پتلے گورے ہاتھ کو دیکھ کر اسے پیپر ویٹ کا خیال کیوں آتا ہے؟ کسی کے کندھوں کو بانہوں میں کس کے چھاتی سے لگانے کا خیال کیوں نہیں آتا؟ اور کسی کے ہاتھ کو اوپر اٹھا کے اپنے ہونٹوں سے چومنے کو خیال اسے کیوں نہیں آتا.....؟"

روی نے اپنے خیالات کی رو پر زور ڈالا۔ بالکل اس طرح جس طرح بہتی ندی میں کوئی بہاؤ کی مخالف سمت میں تیرنا چاہے جیتے جاگتے اعضاء کو بے جان چیزوں کے طور پر سوچنے سے اسے کراہت سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ دوسروں کے اعضا تو زندہ ہیں صرف اس کے اپنے اعضا میں کچھ مرگیا ہے۔ اس لئے دوسروں کے اعضاء کو چھونے کا' چومنے کا' اور اپنے اعضاء میں کس

لینے کا خیال اس کو کیوں نہیں آتا؟

روی نے' جو کچھ اس کے اندر مر گیا تھا۔ اس کو زندہ کرنے کی کوشش کی اور اس نے بہت کوشش کر کے' بڑی نظر بھر کے مونا کے چہرے کی طرف دیکھا۔

مونا روی کی بیوی کی چھوٹی بہن تھی۔ چودہ سال کی تھی یا پندرہ کی تھی۔ لیکن روی کو آج تک یہی محسوس ہوتا رہا تھا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ وہ مونا کو بچوں کی طرح ہی جھڑکتا تھا اور بچوں کی طرح لاڈ کرتا تھا۔ آج جب روی نے اپنے خیالات کی رو پر اس طرح زور ڈالا' جس طرح وہ بہتی ندی میں بہاؤ کے خلاف تیرنا چاہتا ہو تو اسے محسوس ہوا کہ مونا پوری جوان لڑکی ہے جوانی نے اس کی چھاتیوں کو بھر دیا تھا۔ اس کی گردن کو بھر دیا تھا' اس کے رخساروں کو بھر دیا تھا اور جوانی نے اس کے پتلے نازک ہونٹوں پر لالی چھڑک دی تھی۔

اور روی کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کا رنگ بہت دنوں سے پھیکا پڑ چکا ہے۔ اس پھیکے رنگ کو گہرا کرنے کے لئے روی کو خیال آیا کہ وہ لال رنگ میں ڈوبے ہوئے مونا کے نازک ہونٹ چوم لے.....

روی نے پہلے کبھی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔ اس لئے اس کو اس خیال سے کچھ دہشت سی محسوس ہوئی اسے لگا کہ لمحہ بھر قبل وہ خیالات کی جس چپ چاپ بہتی ندی میں نہا رہا ہے تھا اب' اس ندی کے پانی میں ایک سانپ تیر آیا تھا ..... یہ اپنے آپ سے دس ہاتھ دور تیرتے ہوئے سانپ کو دیکھنے کی دہشت تھی۔

ویرا جی سو رہے ہو یا جاگ رہے ہو؟" مونا کاغذ کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ روی نے نظر گڑھا کے مونا کے چہرے کی طرف دیکھا مونا کا چہرہ اسی طرح معصوم اور الہڑ تھا۔ جیسا روی ہمیشہ دیکھتا آیا تھا۔ یہ جوانی کی بھڑکتی آگ سے نہ خود دہک رہا تھا' نہ کسی دوسرے کے اندر کچھ دہکا سکتا تھا اور روی نے پھر ایک بار خیالات کی بہتی ہوئی ندی کی طرف دیکھا' ندی میں کہیں کوئی سانپ نہیں تیر رہا تھا۔

روی نے خوف زدہ ہو کے مونا کے گال پر ایک ہلکی سی چپت ماری اور بولا "بلی' چل بھاگ جا یہاں سے' تو یہاں کیا کرنے آئی ہے؟"

"آپ کا کاغذ اڑ کے کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا۔ اگر میں پکڑ کے نہ لاتی تو آپ پھر ڈھونڈتے ہی رہ جاتے ..... لکھی لکھائی نظم ہوا ہو جاتی ....." مونا نے غصے سے کہا۔

"اچھا بلیا! تیرا شکریہ! بہت بہت شکریہ! اب تو یہاں سے چلی جا' میں ذرا ٹھہر کے آؤں گا۔" مونا نے روی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتی ہوئی بولی! "آپ بھی کمرے میں چلئے' دیدی بہت تھکی ہوئی تھی۔ وہ سو گئی ہیں میں وہاں اکیلی جا کے کیا کروں؟"

روی سر سے پیر تک کانپ گیا۔ گویا ندی میں تیرتا ہوا سانپ اس کے قریب آگیا تھا اور اس کے ننگے جسم سے چمٹنا ہی چاہتا تھا۔

روی نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں..... مونا کی سانسیں روی کی پیشانی سے ٹکرا رہی تھیں اور روی کے جسم میں ٹھنڈ کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ روی کو لگا کہ اس نے مونا کو کھینچ کر اپنی چھاتی سے چمٹا لیا ہے۔ مونا کی نرم اور بھری ہوئی چھاتی پر روی کی انگلیاں کانپنے لگی تھیں اور مونا کے پتلے پتلے ہونٹوں کو چھو کر اس کے مردانے ہونٹ بھی کانپنے لگے تھے۔ روی نے محسوس کیا کہ ندی میں تیرتا ہوا سانپ اس کے جسم کو چھو تا گزر نہیں گیا تھا۔ بلکہ اس کے جسم پر اپنا زہری ڈنک مار رہا تھا اور اب اس کا بدن انگاروں کی طرح تپ رہا تھا۔

"ویرا جی! کیا ہوا ہے آپ کو' کیا پھر سو گئے؟" مونا نے اسی طرح معصومیت سے کہا اور انگلیوں سے روی کی بند آنکھیں کو زبردستی کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔

روی کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آرہی تھیں' اس کو باہر کا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا جو سنائی دے رہا تھا وہ اس کے اندر کی آواز تھی' اور اس کے اندر کی آواز کہہ رہی تھی کہ۔ اس کو سانپ کے ڈنک کا زہر چڑھ رہا ہے اس لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتے ہوئے زہر میں روی ڈوبتا جا رہا تھا ..... اسی کیفیت میں روی کو محسوس ہوا کہ اس نے مونا کی

قمیض کو پھاڑ کر اس کے گلے سے اتار پھینکا ہے اور اب مونا کا جسم اندھیرے میں چاندنی کی طرح چمک رہا ہے اور مونا کے بدن کے رنگ نے روی کی آنکھوں میں ایسی چکا چوند مچادی کہ اس کی آنکھیں کانپنے لگیں۔

کانپتی آنکھوں سے روی نے دیکھا کہ اب سانپ کا زہر اس پر اتنا چڑھ گیا تھا کہ اس کا سارا بدن اکڑ کے رہ گیا تھا۔ روی کا شعور اب بھی باعمل تھا' بالکل اسی طرح' جیسی کوئی اپنی موت کا تماشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔ اس کے اعضاء لحہ بہ لحہ اکڑتے جا رہے تھے۔ وہ تڑپ بھی رہا تھا اور اپنے آپ کو تڑپتا ہوا دیکھ بھی رہا تھا۔ تڑپتے ہوئے روی کے دل میں ایک احساس بے بسی تھا اور تڑپتا دیکھنے والے روی کے دل میں خوف تھا۔ ایک روی نے مونا کی طرف ترس ترس کے دیکھا اور دوسرے روی نے ہاتھ کے اشارے سے مونا کو کہا وہ یہاں سے چلی جائے .....

مونا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا' لیکن اس نے روی کے ہاتھ کے اشارے کو مان لیا اور نظم والے کاغذ کو روی کے ہاتھ کے نیچے رکھ کے وہاں سے چلی۔

روی نے گھبرا کے مونا کو آواز دینا چاہی کہ وہ ٹھہر جائے' لیکن اس کے اپنے گلے نے ہی جیسے اس کی آواز کو روک لیا ..... اور تھک کر روی نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

خیالات کی ندی اسی طرح دونوں کناروں کی بندشوں کو قبول کرتی ہوئی چپ چاپ بہہ رہی تھ روی نے اپنے آپ کو ندی کے حوالے کردیا۔ ٹھنڈے پانی کے لمس کی طرح روی کو خیال آیا کہ ایک فلاسفر نے کہیں لکھا ہے کہ آپ کو جینا پڑے گا۔ کیونکہ زندگی کو ق سے نہ نہیں کی جا سکتی۔" اور روی کو خیال آیا کہ یہ تمام فلسفہ بے بسی کا فلسفہ ہے۔ انسان اور کچھ نہیں کر سکتا' تو کیا زندگی کو قبول کرنے سے نہ کرنے کے لئے ایک اپنے ہونٹ بھی نہیں ہلا سکتا ؟ .... روی نے اپنے ہونٹ ہلانا چاہے' لیکن ندی کے ٹھنڈے یخ پانی سے اس کے ہونٹ اتنے سن ہو چکے تھے کہ اب وہ ہلتے نہیں تھے اور روی کو خیال آیا کہ وہ ایک عام سا کمزور آدمی ہے اس نے محبت کا تواریخی ہیرو بننا چاہا تھا' لیکن وہ ہیرو نہیں بن سکا۔ اس نے ایک

درد ناک عاشق بننا چاہا تھا' لیکن وہ پھٹے حال رہنے والا عاشق بھی نہیں بن سکا- وہ عام سا کمزور آدمی ہے- وہ آدمی جس کے ہونٹ نہ "ہاں" کرنے کے لئے ہلتے ہیں' نہ نہ' کرنے کے لئے .... اور پھر روی کو خیال آیا کہ وہ اپنے ہونٹ نہیں ہلا سکتا وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ وہ ایک نظم کی خوبصورتی کا جال پھینک کے ان بند ہونٹوں کی مایوسی اور نا امیدی کو پکڑ سکتا تھا ـــــ اس نے تڑپ کے ہاتھ میں قلم پکڑا اور جلدی سے ادھوری نظم مکمل کرنے کے لئے کاغذ پر کچھ سطریں مزید لکھنے لگا-

نظم پوری ہو جانے پر روی نے بے حد تھکن محسوس کی- خیالات کی ندی میں تیرتے تیرتے اس کے تمام اعضاء نڈھال ہو چکے تھے ندی اب بھی دونوں کناروں کی بندشوں کو قبولتی ہوئی چپ چاپ بہہ رہی تھی اور ندی میں تیرتا ہوا جو سانپ روی نے دیکھا تھا' وہ اب کہیں نظر نہیں آرہا تھا ..... اب روی کے اندر دہشت نہیں تھی' صرف تھکاوٹ تھی-

اور روی کو محسوس ہوا کہ اس کو ٹھنڈ لگ رہی ہے- ندی کا پانی لمحہ بہ لمحہ اور ٹھنڈا ہوتا جا رہا تھا- وہ کنارے کو پکڑ کے ندی کے باہر آگیا اور اپنے بدن سے خیالات کے نچڑتے پانی کو پونچھتا ہوا جلدی جلدی ڈاک بنگلے کی طرف چلنے لگا-

روی کی نظم نے روی کے بدن کا سارا زہر چوس لیا تھا- اب اس اعضاء پہلے کی طرح زہر کے اثر سے سن نہیں تھے' صرف تھکے ہوئے تھے' جن کو ٹھنڈ لگ رہی تھی ..... اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ جلدی جلدی قدم اٹھائے اور اپنی بیوی کے گرم بستر میں جا کے سو جائے-

ایک نمبر کا فرق

دیو کی بہن کو میں نے پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب انہوں نے روپ نگر میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا' مکان نیا بنا تھا اور ابھی اس میں بجلی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے کمپنی کو بجلی لگانے کے لئے درخواست دی تھی------ اور جب درخواست منظور ہو گئی تو میں نے ایک گھر میں بجلی کا کھمبا نصب کر کے سڑک کے کھمبے سے بجلی کا تار جوڑ دیا تھا------ ان دنوں میں بجلی گھر کا ایک معمولی مستری تھا۔

جوں جوں میں بجلی کے تاروں کے لئے دیوار میں گٹیاں لگاتا گیا۔ دیو کی بہن کا چہرہ چمکتا گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کے گھر کے کسی کمرے میں تو بجلی کا کوئی بلب بعد میں چمکے گا لیکن ان کے چہرے پر ایک بلب اسی وقت جل اٹھا تھا---- "آج رات وہ آئیں گے تو مجھے ان کا کمرہ کتنا سندر نظر آئے گا۔"

کھمبے سے رسی باندھ کر جب میں اوپر چڑھا تو دیو کی بہن نیچے کھڑی ہوئی کچھ اتنی پریشان نظر آرہی تھیں جیسے ان کا اپنا بھائی یا بیٹا مصیبت میں پھنسا ہوا ہو۔

اور جب دیو کی بہن کے کمرے میں بجلی لگ گئی تو وہ دوڑ کر میرے اور میرے ساتھی مستری کے لئے چائے بنا لائی اور پیالیاں ہمارے آگے رکھتی ہوئی بولی "آج میرے گھر میں روشنی آئی ہے بھیا۔ اس لئے سب سے پہلے آپ کا منہ میٹھا ہونا چاہئے۔ آپ رسی سے لٹک کر اپنی جان خطرے میں ڈال کر لوگوں کو روشنی تقسیم کرتے ہیں۔"

میں اور میرے ساتھی نے آج سے پہلے بھی کتنے ہی گھروں میں بجلی لگائی تھی لیکن کبھی کسی نے ہمیں روشنی تقسیم کرنے والا' نہیں کہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس کے

بعد بھی کوئی ہمیں خطاب نہ دے گا۔ اس لئے مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہم تو ہر روز ہی رسیوں سے لٹک لٹک کر بجلی کے جھٹکوں سے کھیل کر دنیا میں روشنی پھیلاتے رہتے تھے اور خود ہر لحظہ خطرات کے اندھیرے میں لٹکے رہتے تھے لیکن ہماری دنیا میں کوئی تو ایسا تھا جو ہمارے اندھیرے میں روشنی کر سکتا تھا۔ اور وہ "کوئی" دیو کی بہن تھی!

ایک بات جو میرے لئے انتہائی حیرت انگیز تھی وہ یہ کہ دیو کی بہن کے گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی مندر کی دہلیز پر کھڑے ہوں اور دہلیز سے اندر جاتے ہوئے یہ خیال آتا کہ پاؤں دھو کر اندر جانا چاہئے۔ اندر ایک عجیب قسم کی پاکیزگی تھی جو مندر کی مورتی کے مانند صدیوں پرانی تھی اور مندر کی پوجا کی مانند نت نئی بھی تھی!

یہ احساس مجھے اس وقت ہوا جب بجلی کے تار ملا دیئے گئے اور میں نے دیو کی بہن سے کہا کہ وہ گھر کی تمام بتیاں جلا کر دیکھ لیں۔ اس وقت دیو کی بہن برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی اور وہ فوراً ہی برآمدے کی بتی جلا کر دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے کہا۔

"نہیں یہ بتی بعد میں جلاؤں گی پہلے روشنی ان کے کمرے میں ہوگی!"

اور یہ کہہ کر اس نے بڑے احترام سے ایک کمرے کا دروازہ کھولا تھا، گویا وہ مندر کا دروازہ کھول رہی ہو۔۔۔۔۔ بجلی جیسے روشنی کے پھولوں کی تھالی تھی جو اس نے سب سے پہلے بڑی عقیدت سے اس کمرے میں چڑھا دی اور پھر بعد میں روشنی کا ایک ایک پھول سامنے والے کمرے میں پچھلے کمرے میں باورچی خانے میں غسل خانے میں اور برآمدے میں بطور تبرک تقسیم کر دیا۔

میں نے اس کمرے کو دیکھا۔ کمرے میں ایک سبز غالیچہ یوں بچھا ہوا تھا۔ جیسے پیروں تلے ہری ہری گھاس ہو!

ایک جانب زرد رنگ کا دیوان تھا جو یوں لگتا جیسے ایک ہرے باغ میں زرد پھولوں کی کیاری ہو!

اور اس کے وسط میں ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر رکھی ہوئی ایک مرد کی تصویر ایسی نظر آرہی تھی جیسے کسی فنکار کا تراشا ہوا حسین مجسمہ!

اس باغ میں صرف ایک چشمے کی کمی نظر آرہی تھی۔ لیکن جب بتی جلی تو یوں نظر آیا جیسے دودھیا پانی کی دھار بہہ رہی ہو!

عجیب بات ہے کہ دیو کی بہن کے گھر میں کھڑے ہوکر ایک مندر کا خیال بھی آتا تھا اور ایک باغ کا بھی!

دوسری دفعہ میں نے دیو کی بہن کو اسی دن دیکھا جب ان کے پڑوسی نے اپنے مکان کی چھت پر ایک کمرہ تعمیر کرایا اور مجھے کمپنی کی جانب سے دیو کی بہن کے گھر بھیجا تاکہ میں ان کے گھر میں لگا ہوا بجلی کا کھمبا اس کی موجودہ جگہ سے اکھاڑ کر بلندی پر لگا دوں۔ کیونکہ اس کے تار پڑوسی کے نئے کمرے کے قریب سے گزرتے تھے جو بجلی کمپنی کے ضابطے کے خلاف تھا۔

"اچھا بھیا' اسے نکال کر وہاں لگا دو" دیو کی بہن نے کہا۔

لیکن جب میں کمرے کی دیوار میں سوراخ کرنے لگا تو دیو کی بہن گھبرا اٹھی "بھیا یہ سوراخ باہر کی طرف ہی رہیں گے نا؟ اندر تو نہیں نظر آئیں گے نا؟"

"سوراخ تو آر پار ہوں گے کیونکہ دیوار صرف نو انچ کی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تب تو کمرے کی دیوار خراب ہو جائے گی۔ چار سوراخ چار داغ!"

"بعد میں سفیدی کرا لینا۔"

"میں نے اس کمرے میں آئل پینٹ کرایا ہے پورے کمرے میں دوبارہ آئل پینٹ کرانا پڑے گا اور ان دنوں آئل پینٹ بہت مہنگا ہے۔"

"کوئی بات نہیں' بہن جی جہاں پلستر اکھڑ جائے گا وہاں ایک کیلنڈر لگا دینا۔ تمام داغ اس کیلنڈر کی پشت کے پیچھے چھپ جائیں گے۔"

"ویسے ہی جس طرح لوگ من کی دیوار پر پاپوں کے داغ دھبے چھپانے کے لئے دھرم اور خدمت خلق کا کلینڈر لٹکا دیتے ہیں؟" دیو کی بہن کے لہجے میں طنز کی

کھنک صاف نمایاں تھی۔

"اچھا میں اپنی طرف سے کوشش کروں گا کہ تمام سوراخ دیوار کے باہری حصے میں رہیں اندر کی جانب نہ ابھریں لیکن پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کس حد تک میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا۔ آپ احتیاطاً، اندر دیوار کے ساتھ کوئی کپڑا بچھا دیں کہ اگر پلستر کا کوئی ٹکڑا اندر گرے بھی تو کمرے کی کوئی چیز خراب نہ ہو۔" میں نے ہتھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھیا۔ میں کپڑا وپڑا نہیں بچھاؤں گی۔ اگر تم نے اپنے من میں رتی بھر ٹکڑا گرانے کی رعایت رکھ لی، تو تمہاری ہتھوڑی بلا شبہ بے پروا ہو جائے گی۔" دیو کی بہن نے طویل سانس کھینچ کر کہا۔ "یہ اعتماد کچھ عجیب شے ہے بھیا۔ اگر اس میں شک کا چھوٹا سا سوراخ بھی ہو جائے تو پھر بڑی بڑی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔"

میں نے دیو کی بہن کے چہرے کو دیکھا اور پھر دیوار کو---- اور جب میں نے دیوار پر ہتھوڑی کی پہلی ضرب لگائی تو میں نے محسوس کیا جیسے ہتھوڑی میرے ہاتھ میں نہ ہو اعتماد کے ہاتھ میں ہو اور اس احساس کے بعد کوئی ضرب دیوار کے اندرونی حصے تک نہیں پہنچ سکتی تھی!

میں خود حیران تھا کہ کیونکہ میری ہتھوڑی نے نو انچ موٹی دیوار میں سات انچ گہرا سوراخ کر دیا اور دیوار کے اندرونی حصے پر ایک نشان بھی نہ پڑا۔ لوہے کی سلاخوں کا منہ توڑ کر میں نے آٹھ آٹھ انچ لانبی سلاخیں سات سات انچ کے سوراخ میں گاڑ دیں۔

جب دیو کی بہن نے کمرے کی دیوار کا چہرہ پہلے ہی جیسا پایا تو کہنے لگی۔ "کیوں بھیا۔ کیا میں نے غلط کہا تھا؟ واقعی یہ اعتماد عجیب شے ہے۔ اگر تم اپنے من میں رتی بھر کی بھی رعایت رکھ لیتے تو یقیناً، بڑی بڑی پرتیں دیوار سے اتر جائیں!

اور میں کئی دنوں تک اعتماد کے فلسفے پر غور کرتا رہا!

تیسری بار میں دیو کی بہن سے اس وقت ملا جب مجھے اپنے گاؤں سے اپنی ماں کا خط ملا کہ اب وہ شہر میں میرے پاس آکر رہنا چاہتی تھیں۔ میں اور میرے دو

ساتھی جس چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے اس میں ماں کا گزارہ ہونا ناممکن تھا اس لئے میں کرائے کے لئے مکان تلاش کرتا ہوا دیو کی بہن کے گھر جا پہنچا۔

دیو کی بہن کچھ دیر خاموش کھڑی کچھ سوچتی رہی' پھر بولی۔ "اچھا بھیا میں اپنا پچھلا کمرہ تمہیں دیئے دیتی ہوں۔ میرا بھی بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے گا۔ اکیلے پورے مکان کا کرایہ دینا بہت بھاری پڑ رہا ہے۔"

"لیکن دیو کی بہن وہ کمرہ تو۔۔۔۔"

"وہ یہاں نہیں ہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔" دیو کی بہن نے صرف اتنا ہی کہا۔

اور میں نے مزید دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا۔

میں نے ایک ماہ کا پیشگی کرایہ دیو کی بہن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

تیسرے دن جب میری ماں گاؤں سے آگئی تو میں نے اپنا سامان اٹھایا اور دیوی کی بہن کے پچھلے کمرے میں آگیا۔

دیو کی بہن نے جب کھانا تیار کیا تو میز پر اس طرح سنوار کر رکھا جیسے ابھی کوئی آنے والا ہو! پھر ایک گھنٹہ گزر گیا۔ دو گھنٹے گزر گئے۔ کافی رات ہو گئی۔ لیکن کوئی نہ آیا تو دیو کی بہن نے ان کھانوں کو اچھی طرح ڈھک دیا اور خود باسی کھانا کھا کر سو گئی۔

دوسرے دن بھی دیو کی بہن نے ایسا ہی کیا۔ بہت شوق سے تازہ کھانا پکایا۔ میز پر سجایا۔ دیر تک بیٹھی راہ تکتی رہی۔ پھر اس کھانے کو ڈھک دیا اور باسی کھانا کھا کر سو گئی۔

تیسرے دن بھی دیو کی بہن نے یونہی کیا۔ چوتھے دن بھی اور ہر روز یونہی کرتی رہی!

ایک دن میں نے حیران ہو کر دیو کی بہن سے پوچھا کہ۔۔۔۔

"کیا وہ بتا کر نہیں گئے کہ کب آئیں گے؟"

"خیال تھا کہ آج آجائیں گے۔ آج نہیں آئے تو کل آجائیں گے۔" انہوں نے صرف اتنا ہی کہا۔ اور میں حیرت و استعجاب کے عالم میں سوچتا رہا کہ دیو کی بہن

کا یہ اعتماد کیا تھا۔ ہر روز کھانا باسی ہو جاتا تھا لیکن وہ اعتماد تازہ رہتا تھا۔ دیو کی بہن ہر روز باسی کھانا کھاتی تھی۔ اور تازہ اعتماد کے ساتھ جیتی تھی۔

پھر شاید دیو کی بہن کو پیسوں کی تنگی ہو گئی۔ اس نے ایک اسکول میں نوکری کر لی۔ ہر روز اسکول جاتے وقت وہ ایک خط لکھتی اور اپنے کمرے میں تالا ڈال کر خط اس کے کنڈے میں پھنسا دیتی۔ وہ لکھتی کہ وہ اتنی دیر کے لئے اسکول جا رہی ہے اور اتنے وقفے کے بعد واپس آجائے گی۔

جب دیو کی بہن بھاگی بھاگی اسکول سے واپس آتی تو وہ خط اسی طرح کنڈے میں پھنسا ہوا ہوتا۔ ان کے جانے کے بعد نہ کوئی آتا نہ کوئی وہ خط پڑھتا اور اگلے دن دیو کی بہن نئی تاریخ ڈال کر نیا خط لکھتی!

ایک دن جب میں نے اس سے پوچھا' تو کہنے لگی "بھیا تم فکر نہ کرو۔ وہ ایک بار نہیں کئی بار مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ لیکن چند دنوں بعد واپس آتے رہے ہیں۔ وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتے!"

"ایک بار نہیں کئی بار؟" میں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

"ایک بار گئے تو ایک ماہ بعد واپس آئے۔ پھر گئے تو کافی مدت کے بعد آئے--- پھر----"

"لیکن وہ کہاں جاتے ہیں؟ ان کا کوئی پتہ ٹھکانہ نہیں ہے؟"

"کچھ معلوم نہیں۔ نہ جانے ان کے دل میں کیا آتا ہے----"

"کہیں ایسا تو نہیں دیو کی بہن کہ انہوں نے شاید کوئی دوسری عورت----"

"تم بھی کیسے پاگل ہو بھیا۔ کوئی دوسری عورت ہو بھی تو اس بے چاری کو کیا خبر کہ انہیں کیا چاہیئے! وہ صرف میں جانتی ہوں۔"

"لیکن دیو کی بہن تم نے ان سے کبھی کچھ پوچھا نہیں۔ ان سے کبھی کچھ کہا نہیں"؟

"کہا کیوں نہیں بھیا۔ میں نے ان سے صرف ایک بات کہی تھی---- تم

مجھے بھلے ہی کتنی ہی بار چھوڑ کر جاؤ لیکن اتنا دھیان رہے کہ جتنی بار جاؤ اس سے ایک بار زیادہ واپس آجانا۔ میرا مطلب ہے۔۔۔"

دیو کی بہن نے اپنے سینے پر یوں ہاتھ رکھا جیسے وہاں سخت درد اٹھ رہا ہو' مجھے معلوم تھا کہ اکثر اس کے سینے میں درد اٹھا کرتا تھا اور وہ روئی گرم کر کے اسے سینکا کرتی تھی۔

دیو کی بہن نے سانس کھینچ کر کہا۔۔۔" میرا مطلب ہے کہ میں نے کہا تھا کہ اگر دس بار جانا تو گیارہ بار واپس آنا' گیارہ بار جانا تو بارہ بار واپس آنا۔ بس ایک بار زیادہ۔۔۔ اور میں کچھ نہیں کہتی۔ بس ایک بار زیادہ۔"

دیو کی بہن کی آنکھیں چمک اٹھیں' اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے کہا۔ "اگر جدائی بیس بار ہو تو ملاپ اکیس بار۔ بچھڑنا پچاس بار تو ملنا اکیاون بار۔ یہ فراق اور ملاپ اپنی اپنی باری سے آتا رہا۔ لیکن آخر میں ملاپ جیتے گا۔۔۔ ایک نمبر کے فرق سے۔۔۔ ایک نمبر۔۔۔!!"

"تمہارا اعتماد نہیں ٹوٹتا دیو کی بہن؟"

"ٹوٹتا ہے بھیا' لیکن پھر جم جاتا ہے۔ اعتماد بھلے ہی پچاس بار ٹوٹے لیکن اسے اکیاون بار جمنا چاہیئے۔ ایک بار زیادہ۔۔۔ بس ایک بار!"

دیو کی بہن سانس لینے میں دقت محسوس کرنے لگی۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ روئی گرم کر کے دیو کی بہن کا سینہ سینک دیں۔

بعد میں تقریباً ہر روز دیو کی بہن کے سینے میں درد اٹھنے لگا اور تیسرے دن اسکول کا ناغہ ہونے لگا۔ لیکن وہ ہر روز مندر جیسے باغ جیسے کمرے میں تازہ ہوا آنے دیتی۔ تازہ کھانا پکاتی۔ اسکول یا ڈاکٹر کے ہاں جاتے ہوئے تازہ خط لکھتی اور اپنے باسی ہوتے پھیپھڑوں میں تازہ سانس بھر لیتی!

دیو کی بہن کا بھائی انہیں لینے آیا' لیکن وہ نہ گئی۔ وہ اس گھر میں رہ کر گویا ایک نمبر کی رکھوالی کر رہی ہو۔ بچھڑنا بیس بار تو ملنا اکیس بار---- وہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ ان کا ملاپ ایک نمبر سے مات کھا جائے!

ڈاکٹر نے کئی بار دیو کی بہن سے کہا تھا کہ اب ان کے بچنے کی امید نہیں! لیکن ان کی جان نہیں نکل رہی تھی! گویا ان کی جان ان کے گلے سڑے ہوئے پھیپھڑوں میں بیٹھ کر ایک نمبر کی رکھوالی کر رہی ہو۔ بے اعتمادی پچاس بار تو اعتماد اکیاون بار۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا اعتماد ایک نمبر کے لئے ہار جائے!

ایک دن دیو کی بہن کی سانس اکھڑ گئی۔ اس نے اپنی کلائی سے سونے کی چوڑیاں اور انگلیوں میں سے---- انگوٹھیاں اتار دیں۔ اپنے تکیے کے نیچے سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میرے ہاتھ میں دے کر بولی۔

"بھیا۔ میری ایک بات مانو گے؟"

"آپ حکم دیں دیوی بہن!"

"اب تم بڑے مستری بن گئے ہو۔ اس لئے اب کچھ زیادہ کرایہ ضرور دے سکتے ہو۔ میرے بعد یہ مکان نہ چھوڑنا' میرا کمرہ تم خود لے لینا' اور وہ کمرہ---- ان کا کمرہ---- بس جوں کا توں رہنے دینا اور ہر ماہ اس کمرے کا کرایہ اس وقت تک ادا کرتے رہنا جب تک یہ رقم ختم نہ ہو جائے۔ یہ رقم دو سال تک ختم نہ ہوگی۔" دیو کی بہن نے اپنی اکھڑی سانسوں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "خبر نہیں وہ کب آجائیں---- شاید آج ہی آجائیں۔"

میں نے گھبرا کر ان کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض دھیمی چل رہی تھی۔

دفعتاً کمرے کا دروازہ یوں کھلا جیسے کسی نے گھبراہٹ میں دھکا دیا ہو۔

آنے والا ایک منٹ کے لئے ٹھٹک کر کھڑا رہا۔ پھر دیو کی بہن کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔

دیو کی بہن نے آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک ابھر آئی تھی۔

دیو کی بہن نے ہونٹ کھولے' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

"میں آگیا ہوں۔"

آنے والے کی زبان کے بدلے اس کے جسم کی تھرتھراہٹ نے کہا۔

"مجھے پتہ تھا کہ تم آؤ گے۔" دیو کی بہن کے اعتماد نے جواب دیا۔

دیو کی بہن کی نکلتی ہوئی جان ایک پل کو ٹھہر گئی۔ جیسے اس کی زندگی نے یہ ایک پل موت سے کھیلتے ہوئے جیت لیا تھا۔ ایک پل کے فرق سے موت ہار گئی اور زندگی جیت گئی۔ ایک بار کے فرق سے بے اعتمادی ہار گئی---- اور اعتماد جیت گیا۔!!

دیو کی بہن اس دنیا سے چلی گئی۔

گو کہ ان کی دی ہوئی رقم سے میں نے ان کے پریمی کا بہت علاج کیا۔ لیکن وہ بھی دیو کی بہن کے پیچھے چلا گیا۔

شاید دوسری دنیا میں دیو کی بہن ایک مندر ایک باغ جیسا کمرہ بنا کر اس کی راہ دیکھ رہی تھی!

پاکیزگی غالباً ایک چھوت کی بیماری ہوتی ہے جو مجھے دیو کی بہن سے لگ گئی ہے۔ میں ہر روز اس مندر جیسے' اس باغ جیسے کمرے کو کھولتا ہوں---- اسے جھاڑتا پونچھتا ہوں اور پھر بڑی عقیدت اور بڑے احترام سے بند کر دیتا ہوں۔!

ہر روز زندگی کے ایک موڑ پر میرا اعتماد ٹوٹتا ہے اور دوسرے موڑ پر جڑ جاتا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ دیو کی بہن کا وہ کمرہ اس دنیا میں ایک نمبر کی رکھوالی کر رہا ہے۔ بے اعتمادی پچاس بار تو اعتماد اکیاون بار---- ایک نمبر کا فرق---- بس ایک نمبر کا فرق!!

ملاح کا پھیرا

سمندر کے کنارے لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ہر عمر کے لوگ، ہر قوم کے لوگ اور ہر دیس کے لوگ تھے۔

بعض لوگ بڑے انہماک کے ساتھ سمندر کی طرف تاحد نگاہ دیکھ رہے تھے۔ بعض لوگ بھیڑ میں کچھ اس طرح منہمک تھے۔ جیسے انہیں سمندر سے کوئی سروکار نہ ہو۔ بعض لوگ مکئی کے بھنے ہوئے بھٹے چبا رہے تھے۔ بعض لوگ مونگ پھلی چھیل رہے تھے اور بعض ناریل کا پانی پی رہے تھے۔ کچھ بچے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے ریت کے گھروندے بنا رہے تھے۔ سمندر کی چھاتی پر کچھ جھلملانے لگا۔ بعض لوگوں کے دلوں کی دھڑکن تیز ہوگئی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی کچھ اس طرح معلوم ہو رہی تھی جیسے آسمان نے اپنے ایک کنارے سورج کا پیالہ پکڑ کر اسے اوندھا کر رکھا ہو اور اس میں سے سرخی ٹپک ٹپک کر سمندر میں گر رہی ہو۔

پانی کے جھلملانے سے ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی کشتی کنارے کی طرف آرہی ہو۔ بعض لوگوں نے اس بات کی طرف بالکل دھیان نہ دیا۔ مگر بعض لوگ جو اس طرف متوجہ تھے۔ ان کے ہاتھوں سے مکئی کے بھٹے، مونگ پھلی اور ناریل کا پانی گر پڑا۔۔۔۔ سمندر کی لہروں کے آپس میں ٹکرانے سے ایک ساز سا پیدا ہو رہا تھا۔ چپو کی آواز کے ساتھ ساتھ ملاح کے گانے کی آواز کنارے کی طرف آرہی تھی۔

ملاح کے گیت گانے کا انداز جادو کرنے کے بجائے جادو اتارنے والا معلوم ہو رہا تھا۔ کنارے پر کھڑے ہوئے لوگ جنہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام

رکھے تھے۔ یکایک چھوٹ گئے جوں جوں ملاح کی آواز بلند ہوتی گئی اور کشتی کنارے کی طرف بڑھتی گئی۔ بعض لوگوں کے دلوں میں امید کی کرن پھوٹی۔ بعض لوگ ناامیدی ظاہر کرنے لگے اور بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

کشتی کنارے پر پہنچنے کے بعد ملاح نے لوگوں کی طرف دیکھ کر بلند آواز کے ساتھ کہا "ہے کوئی سواری؟" ملاح کی یہ آواز سن کر لوگوں میں حوصلہ نہ رہا۔ انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ کنارے پر پھیلی ہوئی ریت پر تسلی سے بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔

اب سورج غروب ہوگیا تھا اور معلوم ہورہا تھا کہ سمندر نے سورج کے پیالے میں سے تمام سرخی پی لی ہو۔ اب گہرا اندھیرا چھانے لگا۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو پلٹنے لگے ملاح نے حقہ ایک طرف رکھ دیا اور سمندر کے خالی کنارے کی طرف دیکھنے لگا۔ سمندر سے پانی کی اٹھتی ہوئی لہریں دور دور تک پھیل رہی تھیں اور ریت پر بکھرے ہوئے چھلکے وغیرہ اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ لہروں کے آنے اور واپس جانے سے ریت پر پڑے پاؤں کے نشان تک مٹ گئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ بچوں کے بنائے ہوئے ریت کے گھروندے بھی بہہ گئے تھے۔

ملاح نے ناریل کے جھنڈ میں بنی ہوئی جھونپڑی کی طرف دیکھا۔ جھونپڑی میں ابھی تک دیا جل رہا تھا۔ ملاح اس جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

"ابھی تم جاگ رہی ہو؟" ملاح نے جھونپڑی کے بند دروازے کو کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

"اندر آجاؤ تمہارا ہی انتظار کر رہی ہوں۔"

جھونپڑی کے اندر سے عورت کی آواز آئی۔ "یہاں پر بیٹھ جاؤ۔" عورت نے پھر کہا اور جھونپڑی کے اندر ایک کونے میں پڑی ہوئی بوری کو ایک مرتبہ جھاڑ کر پھر بچھا دیا۔

"کوئی سواری نہیں ملی" ملاح نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

"میں کہتی ہوں تم یہ روز روز کا کام چھوڑ دو۔ تمہیں کبھی سواری ملتی ہے کبھی نہیں؟"

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو' بتاؤ ناریل پیئو گے۔؟"

"میں ناریل ہی تو پینے آیا ہوں!"

"اچھا بتاؤ کون سا ناریل لاؤں؟ پانی والا۔ ملائی والا یا گری والا۔؟"

"آج تو میرا دل بہت اداس ہے۔ تم مجھے تینوں ناریل ہی پلا دو۔ پہلے پانی والا' پھر ملائی والا پھر موٹی گری والا۔"

عورت نے ٹوکری میں سے تینوں ناریل نکالے اور باری باری توڑ کر ملاح کے ہاتھ میں دے کر کہنے لگی۔ "کیا میٹھے بھی ہیں یا نہیں"؟ بہت زیادہ میٹھے ہیں۔" ملاح نے کہا اور موٹی گری میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر عورت کو دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"لو تم خود کھا کر دیکھو۔"

"تمہارا شکریہ کس زبان سے ادا کریں کہ تم یہاں گھڑی بھر کے لئے آجاتے ہو۔ اگر تم یہاں نہ آتے تو میں یہ ناریل کے سارے درخت جڑوں سے اکھڑوا دیتی۔

ملاح مسکرایا اور کہنے لگا "جبھی تم کہتی ہو۔ کہ یہ ہر روز کا بکھیڑا چھوڑ دوں؟ اگر میں سواریوں کی امید چھوڑ دوں اور کشتی لے کر کبھی بھی اس کنارے پر نہ آؤں تو تم اس زمین پر ناریل کے درخت نہیں بیجو گی؟"

"یہ تم سچ کہتے ہو!" عورت نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کوئی سواری نہیں ملتی---- کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ تجھے ہی کشتی میں بٹھا کر لے جاؤں۔"

"یہ بات تو پہلے بھی تم کئی بار کہہ چکے ہو۔ مگر یہ تمہارے بس کی بات نہیں" عورت نے اپنے دوپٹے کے کونے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

"یہی تو دکھ ہے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں" ملاح نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ کیسا کارخانہ بنایا ہے قدرت نے! دعوت کے دل میں ایک مرد کی خواہش ہوتی ہے۔ اور مرد کے دل میں عورت کی آرزو۔ قدرت کے اس کارخانے میں کون دخل دے سکتا ہے؟"

"لیکن عورت کو کبھی وہ مرد نہیں ملتا۔ جس سے اس کے دل کی خواہش پوری ہو سکے اور نہ ہی مرد کو ایسی عورت ملتی ہے جس سے اس کی تمنا بر آسکے۔"

"من کا یہ بہت بڑا سمندر کوئی بھی پار نہیں کر سکتا' میں نے تبھی تو یہ کشتی بنائی ہے۔ مگر سمندر کی دوسری جانب کی وادی بالکل خاموش ہے۔ اس لئے اس طرف لے جانے کے لئے مجھے کوئی سواری ہی نہیں ملتی۔"

"مگر یہاں تو کافی گہما گہمی ہے۔ رہنے کے لئے گھر نہیں' کھانے کے لئے روٹی نہیں۔ لوگ خانہ بدوشوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔"

"پھر بھی سبھی لوگ ادھر ہی رہتے ہیں۔ میں تو روزانہ کشتی لے کر آتا ہوں----!"

"تمہارا کرایہ کون ادا کرے؟ تم تو ثابت دل کا کرایہ مانگتے ہو---- وہ بھی کوئی دے دے---- بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس ثابت دل ہیں---- مگر ساتھ ہی انوکھی شرط ہے کہ تمہاری کشتی میں نہ تو کوئی اکیلی عورت بیٹھ سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اکیلا مرد۔ اگر عورت کے پاس بھی ثابت دل ہو تو مرد کے پاس بھی ثابت دل---- پھر وہ دونوں تیری کشتی میں بیٹھ سکتے ہیں۔"

"میں نے تجھے بتایا ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ تو قدرت کا اصول ہے۔ نہیں تو میں تجھے اکیلے ہی کشتی میں بٹھا کے لے جاتا اور پھر تجھ سے اپنی دنیا آباد کر لیتا۔"

"تم اب میرے زخموں پر کیوں نمک پاشی کر رہے ہو؟ اب تو میری عمر ڈھل چکی ہے۔ اب تو میری یادوں کے زخ بھر چکے ہیں۔"

"زخم تو کبھی نہیں بھرتے! تم کیا سوچتی ہو' یہ زخم صرف جوانی ہی میں لگتے ہیں۔ یہ درد جسم کا نہیں۔ پگلی! یہ روحوں کا درد ہے۔ روحوں کی عمر کبھی نہیں

ڈھلتی۔"

عورت نے سر نیچا کرلیا۔ جیسے اس کی روح پر پڑے ہوئے تمام زخم پگھل گئے ہوں۔

"تجھے وہ دن بھول گیا ہے جب ایک مرد تمہارا ہاتھ پکڑ کر میری کشتی میں بیٹھنے کے لئے آیا تھا---- تو پھر وہ کنارے پر کھڑی ہوئی اور لڑکیوں کو دیکھ کر تمہاری طرف سے بددل ہو گیا۔ اس کا دل ثابت نہ رہا---- وہ میرا کرایہ نہ دے سکا اور پھر تمہارا ہاتھ چھوڑ کر کنارے پر لگی ہوئی بھیڑ میں گم ہو گیا۔"

"بس کرو بس کرو---- میرے زخموں کو تازہ نہ کرو۔" عورت رونے لگی۔

"اچھا چپ کرو۔ میں اب اس کی بات نہیں کروں گا۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمہارے شہر کا اب کیا حال ہے؟ کیا تمہارے شہر کو ہی دنیا کہتے ہیں؟"

"کیا میرے شہر کا حال تم سے پوشیدہ ہے" عورت نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"میں شہر تو کبھی نہیں گیا۔ یہیں کنارے سے ہو کر واپس چلا جاتا ہوں مرد اور عورت آپس میں کیسے رہتے ہیں؟"

"عورت کو ہر طرح کی بدنامی سے بچنے کے لئے ایک گھر کی ضرورت ہوتی ہے اور مرد کو دن رات غلامی کرنے والا نوکر' اسے عورت سے بڑھ کر کوئی اچھا نوکر نہیں مل سکتا اس لئے روٹی کپڑا منظور کر کے مرد یہ سودا منظور کرلیتا ہے اور اسے ہمارے شہر میں بیاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔"

"اسی بیاہ کے ساتھ ان کی عمر بسر ہوتی ہے؟"

"بسر کیسے ہوتی ہے۔ موقعے کو غنیمت جان کر کوئی مرد کسی کی عورت کو گھڑی بھر کے لئے چرا لیتا ہے اور گھڑی بھر کے لئے کوئی عورت کسی کا مرد چھین لیتی ہے۔"

"کہتے ہیں تمہارے شہر میں اب بہت اچھی اچھی عمارتیں بننے لگی ہیں۔ وہاں پر لوگ آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں' ہنستے ہیں' گاتے ہیں اور ناچتے ہیں۔"

"تجھے پتا ہے۔ اس سمندر کا پانی بہت میٹھا ہوا کرتا تھا۔ پھر لوگوں نے اپنے جھوٹے برتن اس میں دھونے شروع کردیئے اور سمندر کا پانی کھارا ہوگیا۔ اب لوگ چاولوں کو خوب پکا کر گاڑھا کر لیتے ہیں۔ بالکل پانی جیسا سفید۔ اس پانی میں نامعلوم کیا چیز ہوتی ہے کہ لوگ پیتے ہیں تو گھڑی بھر کے لئے اونچی آواز سے ہنسنے لگتے ہیں۔ گانے لگتے ہیں' ناچنے لگے ہیں۔ جب اس پانی کا اثر زائل ہو جاتا ہے تو وہ بہت کمزور ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"حاکم اور محکوم کا آپس میں کیا سلوک ہے؟"

"حکومت کی کرسی نامعلوم کون سی لکڑی کی بنی ہے جو بھی اس پر بیٹھتا ہے۔ اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔"

"لوگ کتنے محنتی ہیں؟"

"بعض لوگ تو بہت زیادہ محنتی ہیں۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے ہاتھ پاؤں بالکل نہیں ہلاتے۔ انہیں بہت سے ایسے ڈھنگ آتے ہیں' جن سے وہ دوسروں کی محنت کا ثمرہ خود حاصل کر لیتے ہیں۔"

"تمہارے شہر میں بالکل انصاف نہیں کیا؟"

"کہتے ہیں کہ لوگوں نے بغاوت کا فتویٰ لگا کر اسے اپنے شہر سے نکال دیا ہے!"

"پھر اب انصاف کہاں ہے؟"

"کہیں کسی کے دل میں شاید تھوڑا بہت ہو۔ مگر اب انصاف کچہریوں میں بھی کہیں نہیں ملتا۔"

"سنا ہے لوگوں نے بڑی بڑی ایجادیں کی ہیں؟"

"جس طرح کسی انجان کے ہاتھ میں چھری آجائے تو بجائے اس سے کچھ تراشنے کے چیز کا ستیاناس کر لیتا ہے۔ اسی طرح لوگ پہلے تو کوئی چیز ایجاد کرتے ہیں۔ جب کامیاب نہیں ہوتے تو پھر اسی کا نام بھی مٹانے لگتے ہیں۔"

"اب اور کیا پوچھوں میں؟ جو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں وہ تو بڑا لمبا چوڑا حصہ

ہے۔"

"کچھ نہ پوچھو۔ تم پوچھو بھی تب اگر تمہیں کسی بات کا پتا نہ ہو۔ تم خود سب کچھ جانتے ہو۔ تم بہت دھوکے باز ہو!"

"ہاں سچ تمہارے شہر میں ادیب بھی تو ہوں گے؟"

"ہاں ہیں تو سہی مگر وہ اپنی آواز بلند نہیں کر سکتے۔"

"اگر وہ اپنی آواز بلند کریں تو لوگ انہیں بھی شہر سے باہر نکال دیں، کس چاہت سے وہ وادی کی باتیں کرتے ہیں اس من کے سمندر کی باتیں۔ تم تو کشتی کے ملاح ہو۔"

"کیا وہ میرے نام سے واقف ہیں۔"

تمہارے نام سے کون واقف نہیں۔ تمہیں تو سبھی جانتے ہیں "سپنا"!

ملاح نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا "پھر وہ کبھی میری کشتی میں سوار کیوں نہیں ہوتے اور اس سمندر کو پار کیوں نہیں کرتے۔"

"تمہاری شرط پوری نہیں کر سکتے۔" عورت نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"جیب میں کئی لوگوں کے پاس کرایہ ہوتا ہے مگر انہیں ان کا ساتھی نہیں ملتا۔ تمہارے گیت کو انہوں نے کئی مرتبہ سنا ہے اور گایا ہے۔ مگر ان کے ساتھیوں نے کبھی اس کی داد نہیں دی۔"

ملاح نے سر جھکا لیا۔

"ایک بات پوچھوں" عورت نے آہستہ سے کہا۔

"پوچھو!"

"اب اس کا کیا حال ہے۔ کبھی تم نے پوچھا ہے اس سے؟"

"کس سے؟"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔ وہی آدمی جو ایک دن میرا ہاتھ پکڑ کر تمہاری کشتی میں بٹھانے کے لئے لایا تھا۔"

"تم اب کس لئے اس کا حال پوچھتی ہو؟"

"یونہی۔"

"تم جس طرح ناریل بیچتی ہو۔ اسی طرح وہ چائے بیچا کرتا ہے۔"

"کوئی عورت اس کے پاس ہوگی؟"

"ہاں بہت سی عورتیں اس کے پاس اور آگئی ہیں۔"

"کیا وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر تمہاری کشتی میں سوار نہیں ہوا؟"

"اب اس کے پاس مجھے دینے کے لئے کرایہ نہیں ہے!"

"عورت نے آنکھیں بھر لیں۔"

"میں جاؤں اب؟" ملاح نے پوچھا۔

"جس طرح تمہاری مرضی!"

"میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میری کلپنا۔ میری پیاری کلپنا" اور ملاح کھڑا ہوگیا۔

عورت نے اپنی جھونپڑی کا دروازہ بند کیا۔ دیا بجھا دیا۔ باہر سمندر کی لہروں سے ساز بجنے کی آواز اور ملاح کے گیت کی آواز آنے لگی جو لحظہ بہ لحظہ کنارے سے دور جارہا تھا۔

اپنی کہانی

میرا اوپر کا دھڑ ثابت ہے مگر میری ٹانگیں چوہوں نے کاٹ لی ہیں اس لئے میں جہاں پڑا ہوا ہوں۔ وہاں سے ہل نہیں سکتا۔

میری دائیں طرف خربوزوں کے کچھ چھلکے پڑے ہوئے ہیں' بائیں طرف باسی روٹی کا ایک ٹکڑا ہے اور میرے آگے پیچھے کسی نے جھوٹے برتن صاف کر کے راکھ بکھیر دی ہے۔

ابھی ابھی بھوک کی ماری ایک گائے ادھر سے گزری تھی۔ اس نے اپنی زبان سے مجھے سر سے پاؤں تک چاٹا اور پھر مجھے ایک بیکار چیز سمجھ کر چھوڑ دیا۔ خربوزوں کے چھلکے اسے بڑے کام کے معلوم ہوئے۔ کافی چھلکے اس نے ایک بارگی منہ میں سمیٹ لئے۔

پھر ایک مریل سا کتا آیا اور اپنی دم ہلاتے ہوئے مجھے سر سے پاؤں تک سونگھنے لگا۔ اسے بھی میں بالکل فضول چیز لگا اور وہ میرے پاس پڑے روٹی کے ٹکڑے چبانے لگا۔

پھر منڈیر پر بیٹھا ہوا ایک کوا میری طرف اس طرح اڑ کر آیا گویا کسی حسینہ نے اپنے پیارے کا انتظار کرتے ہوئے اس کے لئے چوری ڈال دی ہو لیکن مجھے چوما مارتے ہی کوے کا وہم جاتا رہا اور وہ مجھے چھوڑ کر میرے اردگرد بکھری ہوئی راکھ میں سے چنوں کو ڈھونڈنے لگا۔ اس طرح جہاں پڑا ہوا تھا' وہیں پڑا ہوا ہوں۔

مرتے وقت یا تو لوگ خیرات کرتے ہیں یا وصیت کرتے ہیں' مگر میں کیا کروں؟ نہ تو میرے پاس کچھ ہے کہ خیرات کروں' اور پھر میں نے زندگی میں کوئی

گناہ بھی نہیں کیا کہ مرتے وقت جلدی سے کوئی ثواب کا کام کرلوں---- اور نہ میری کوئی اولاد ہے جس کے نام پر میں وصیت کروں اور ویسے بھی میں نے زندگی میں لوگوں کی محنت کو چرا کر کوئی خزانہ نہیں بھرا کہ مرتے وقت کسی بھائی بھتیجے کو اس کی حفاظت کے لئے بٹھا جاؤں۔

البتہ کئی لوگ مرنے سے پہلے اپنی سرگزشت لکھتے ہیں' وہ میں لکھ سکتا ہوں' بے شک میں جانتا ہوں کہ میں دنیا کا کوئی معزز انسان نہیں ہوں' بلکہ میں تو ایک معمولی سا نقشہ ہوں ایک چھوٹے سے مکان کا نقشہ! مگر میں آپ کو باور کرا دیتا ہوں کہ میں گاندھی کی طرح آورش پسند ہوں' گورکی کی طرح حقیقت پسند اور روسو کی طرح ظاہر پسند۔ اس لئے میں سوچتا ہوں کہ مجھے مرنے سے پہلے اپنی سرگزشت لکھنی چاہیئے۔

ایک دفعہ ایک حسین ترین مرد نے ایک حسین ترین عورت کو دیکھا تھا اور اس کا دل اپنے ہاتھ میں ایک پنسل لے کر کچھ لکیریں کھینچنے لگ گیا تھا۔ بس وہی لکیریں میری لکیریں تھیں۔ ایک چھوٹے سے مکان کے نقشے جیسی لکیریں۔ وہ روز رات کو خوابوں میں ان لکیروں کو سنوارتا رہتا تھا کہ ایک دن اسے وردی پہن کر اس جگہ جانا پڑا جہاں دن رات بندوقوں کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔

لوگوں کی چیخوں سے میرے کان پھٹتے تھے۔ پھر بھی میں نے اپنے مالک کے ذہن میں ایک کونہ ڈھونڈ لیا تھا۔ جہاں میں چپ چاپ پڑا رہتا۔

ایک دن میرے مالک کی خوبصورت چھاتی میں ایک گولی آدھنسی اور وہ تڑپتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا۔ "تم جلدی یہاں سے چلے جاؤ۔ اس بارود کے دھوئیں میں تمہارا سانس گھٹ جائے گا۔ تم وہاں چلے جاؤ جہاں کوئی کسان ہاتھوں سے بیج بکھیرتا ہوا زندگی کے سپنے اگاتا ہے اور جہاں کوئی مزدور سر پر ٹوکری اٹھائے زندگی کے سپنے دیکھتا ہے۔

میں اپنے مالک کی آخری خواہش پوری کرنے کی غرض سے میدان جنگ سے بھاگ آیا اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک کسان کے پاس چلا گیا۔ کسان

نے میرے ساتھ ہنس کر دعا سلام بھی نہ کی۔ اپنے پیروں میں ٹوٹی ہوئی جوتی پہنتے ہوئے کہنے لگا۔ "سر پر قرض چڑھا کر تو میں نے بیج خریدا ہے۔ مجھ سے تو لگان بھی دیتے نہیں بنتا' مجھے تم سے کیا حاصل! میری لڑکی کھجور جتنی لمبی ہو گئی ہے۔ اگر میں کسی طرح اسی کا بوجھ اتار سکا۔ تو میرے لئے بہت بڑی بات ہوگی۔ تم بھائی کسی اور آدمی کے پاس جاؤ۔"

تھکا ہارا میں ایک خوبصورت شہر میں چلا گیا۔ میں ایک بڑی سی مل کے مزدور کے پاس پہنچا۔ مزدور نے میرے ساتھ کلام بھی نہ کیا اور اپنے پھٹے ہوئے کرتے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔ "ہماری مل میں چھانٹی ہونے والی ہے اور میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میں کل دال چاول کہاں سے لاؤں گا۔ میں تمہارا کیا کروں گا؟ میرا چھوٹا بچہ کئی دنوں سے بیمار پڑا ہے۔ اگر میں اس کے لئے کہیں سے دوا بھی لا سکا' تو بڑی بات ہوگی۔ تم بھائی کسی اور آدمی کے پاس جاؤ!"

کھیتوں میں سے نکالا ہوا اور ملوں میں سے دھتکارا ہوا میں سانس لینے کے لئے ایک ندی کے کنارے جا بیٹھا۔ اتنی دیر میں میں کیا دیکھتا ہوں کہ ذرا ہٹ کر ایک درخت کے سائے میں ایک بزرگ آدمی آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔ "اللہ پاک" شکر ہے تیرا کہ میرا بیٹا جوان ہو گیا۔ میرے ہاتھوں کا سہارا بن گیا۔ "اس کی حق کی کمائی کو برکت دینا!"

مجھے محسوس ہوا کہ میں جس آدمی کی تلاش میں تھا' مجھے مل گیا۔ میں جلدی سے اس بزرگ کے پاس چلا گیا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا "یہی" بس یہی خواہش ہے کہ ایک کمرے میں میرا بیٹا اور اس کی بیوی بستے ہوں اور میں چھوٹے سے دالان میں بیٹھا پوتے کو کھلاؤں بزرگ نے اپنے دل کا دروازہ کھولا اور میں جلدی سے اندر چلا گیا۔

یہ بزرگ بہت جگتی تھا۔ اس کا بیٹا جب مہینے کے بعد تنخواہ لا کر اس کی ہتھیلی پر رکھتا تو وہ آدھی رقم تھیلی میں ڈال دیتا اور آدھے پیسوں سے گھر کا خرچ چلاتا مجھے بھی امید بندھ گئی کہ تھوڑے سے مہینوں میں یا تھوڑے ہی برسوں میں

میری جون سنور جائے گی۔ وہ بزرگ کہیں سستی سی زمین کا ایک قطعہ بھی ڈھونڈنے لگا اور بیٹے کے لئے کسی اچھی سی لڑکی کا رشتہ بھی پوچھنے لگا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ شہر بھر میں چاقو اور چھریاں چلنے لگیں۔ پولیس کے آدمی جب اس بزرگ کو بچانے آئے تو کہنے لگے "اگر تمہیں اپنی جان عزیز ہے تو یہاں سے ایک قافلہ جارہا ہے۔ ہم تمہیں اس قافلے میں چھوڑ آتے ہیں۔

وہ بزرگ ابھی حیران ہو کر سپاہیوں کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ میں نے جلد بازی سے کہا "میرا کیا ہوگا؟ آپ شاید جانتے نہیں کہ اس بے چارے بوڑھے نے میرے لئے تھوڑی سی زمین بھی ڈھونڈ رکھی ہے۔ بس تھوڑے سے مہینوں میں"۔۔۔۔

پولیس والے ہنسنے لگے اور کہنے لگے "پگلے" اگر تم اپنی بہتری چاہتے ہو تو کسی ہندو کے دماغ میں جا بیٹھو۔ یہ بوڑھا تو مسلمان ہے"۔۔۔۔

پولیس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی اور میں نے اپنی بات کو مزید واضح طور پر سمجھانے کے لئے کہا۔ "بڑا ایماندار بوڑھا ہے۔ اس کا بیٹا بھی خون پسینہ ایک کر کے کماتا ہے۔۔۔۔"

اب پولیس والوں نے میری بات بھی نہ سنی اور اس بزرگ اور اس کے بیٹے کو ہاتھ سے پکڑ کر قافلے میں چھوڑ آئے۔

بزرگ نے مجھے مشورہ دیا۔ "سچ کہتے ہیں یہ پولیس والے۔ جس جگہ میرا باپ پیدا ہوا۔ پلا اور جوان ہوا' جہاں میں پیدا ہوا' پلا اور جوان ہوا۔ جہاں میرا بیٹا پیدا ہوا اور پل کر جوان ہوا' اگر وہ زمین ہی مجھ سے چھن گئی' تو مجھے تیرا کیا کرنا ہے؟ تو واقعی کسی ہندو دماغ میں جا بیٹھ۔"

اس بزرگ کی ڈھلتی عمر میں مجھے اس کے دل سے نکل جانا بہت برا لگا اور میں اس کے دل کے ایک کونے میں بیٹھ کر اس قافلے کے ساتھ چل دیا۔ ابھی کچھ زیادہ فاصلہ طے نہ کیا تھا کہ اس قافلے پر حملہ ہوا اور اس بزرگ کا جوان بیٹا مارا گیا۔ بے حال ہوتے ہوئے وہ مجھ سے کہنے لگا "اب میں تیرا کیا کروں گا؟ جو دھرتی

میرے بیٹے کے خون کی پیاسی ہو گئی اس دھرتی پر مجھے کوئی گھر نہیں چاہیئے۔" اور اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے دور پھینک دیا۔

جس طرف یہ قافلہ جارہا تھا' اس طرف سے ایک قافلہ آبھی رہا تھا۔ مجھے اداس اور مایوس دیکھ کر اس بزرگ نے میرا ہاتھ پکڑااور کہنے لگا۔ "جاؤ میں اللہ کے نام پر تمہیں ان کے حوالے کرتا ہوں۔ وہ دیکھو' سامنے ہندوؤں کا قافلہ آرہا ہے' تمہاری طرح ہی اجڑا اور اکھڑا ہوا ہے۔ تم کسی اچھے سے ہندو کے دل میں جاکر بس جاؤ۔ جاؤ میرے عزیز۔"

میں اس بزرگ کی بات نہ ٹال سکا اور اس قافلے کو چھوڑ کر اس قافلے میں چلا گیا۔ ایک مرد اپنے اردگرد کے لوگوں کو دلاسا دے رہا تھا۔ "ہماری ہمت نہیں جانی چاہئے۔ ہماری جان سلامت' ہمارا جہان سلامت۔ کیا ہوا ہمارے سروں پر چھت نہیں' ہمارے ہاتھوں میں محنت بستی ہے۔" میں جھٹ اس مرد کے پاس گیا اور میں نے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا جن ہاتھوں سے محنت کی خوشبو آرہی تھی۔

سورج غروب ہی ہوا تھا کہ سارے قافلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ حملہ آور آئے اور اس قافلے کی کئی عورتیں اٹھا کر لے گئے۔ لوگوں کو تسلی دینے والا' میرا مالک اپنا سر پکڑ کر مجھ سے کہنے لگا۔ "دوست تم جاؤ' جو بھی راستہ تمہیں نظر آئے۔ تم میرے بھاگ میں نہیں ہو۔ جس دھرتی پر میری بیوی چھن گئی' اس دھرتی پر میرا گھر نہیں بن سکتا۔۔۔۔" اور اس نے مجھے ایک مرے ہوئے بچے کی طرح اپنے ہاتھوں سے ایک طرف پھینک دیا۔

میں گھومتا رہا' بھٹکتا رہا۔ اس کوٹھڑی کے مکین کے پاس بھی گیا جس سے اس کا مالک مکان اس لئے گالی گلوچ کرتا رہتا تھا کہ وہ کوٹھڑی کا کرایہ نہیں سکتا تھا۔ میں اس شخص کے کمرے میں بھی گیا جو صبح کے وقت ایک گیت لکھنے لگتا۔ تو اوپر کی منزل پر رہنے والی ایک عورت مصالحہ پیسنے لگ جاتی تھی۔ میں اس آدمی کے پاس بھی گیا۔ جس کا پڑوسی روز رات کو شراب پی کر آتا تھا اور اس کی جوان بیٹی کو بڑی بے حیائی سے گھورتا تھا اور وہ آدمی اس کوٹھڑی کو نہ بدل سکنے پر مجبور تھا' کیونکہ

اتنے کرائے پر اور کہیں کوٹھڑی نہ مل سکتی تھی اور میں اس آدمی کے کمرے میں بھی گیا جس کی بیوی نچلی چھت سے پانی کی بالٹیاں بھر کر اوپر لاتی تھی اور جس کا تین مہینے کا حمل گر گیا تھا۔۔۔۔ مگر ان سب لوگوں میں سے کسی نے بھی میرے ساتھ آنکھ نہ ملائی۔

ان کوٹھڑیوں اور کمروں کے جھرمٹ میں ہی ایک اور کوٹھڑی بھی تھی جہاں دن رات کتابیں پڑھنے رہنے والا ایک بانکا نوجوان رہتا تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس کی ماں نے اپنے زیورات بیچ بیچ کر اسے پڑھایا ہے اور اب اسے کوئی نہ کوئی روزگار ملنے ہی والا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نوجوان کو اپنے کالج میں پڑھنے والی ایک لڑکی سے محبت ہے۔ جس طرح میں نے کئی ایک کوٹھڑیوں کا حال دیکھا تھا' ویسے ہی اس نوجوان نے بھی دیکھا اور اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ وہ کسی ایسی کوٹھڑی میں نہیں رہے گا۔ جس کا مالک روز گالی گلوچ کرتا ہوا اور وہ اس کوٹھڑی کی چھت کے نیچے بھی نہیں رہے گا جہاں وہ بیوی کو بازوؤں میں جکڑ کر کوئی گیت گنگنانے لگے' تو اوپر کی چھت پر کوئی زور زور سے مصالحہ پیسنے لگے اور وہ اپنی بیوی کو کسی ایسی کوٹھڑی میں نہیں رکھے گا۔ جس کا پڑوسی شراب پی کر آئے اور اسے بے شرم آنکھوں سے گھورتا رہے اور وہ تیسری منزل پر بھی نہیں رہے گا۔ جہاں پانی کی بالٹیاں چڑھاتے ہوئے اس کی بیوی کا حمل ساقط ہو جائے۔

اس لئے جب میں اس نوجوان کے سامنے پہنچا' تو اس نے مجھے پلکوں پر اٹھا لیا اور اپنی ماں سے کہنے لگا بس اماں'' اب ہمارے دن پھر جائیں گے۔ پتا جی نے ہمارے لئے جو زمین کا ٹکڑا خریدا تھا' اب میں وہاں ایک چھوٹا سا گھر بناؤں گا۔ میرا روزگار تو لگ ہی جائے گا اور آٹھ ہزار' ہم سرکار سے قرضہ لے لیں گے۔ اب تو ہمارا اپنا راج ہے۔'' میں نے یہ باتیں سنیں اور ایک تھکے ہارے مسافر کی طرح اس نوجوان کے دل کی ٹھنڈی چھایا میں بیٹھ گیا۔

ایک دن اس نوجوان نے ایک نقشہ نویس کو بلایا اور اپنے دل میں کھنچی' ہوئی میری ساری لکیروں کو اسے سمجھا دیا اور اس سے کہا وہ جلدی سے ایک

چھوٹے سے گھر کا نقشہ بنا لائے۔

ایک عرضی اس نے سرکار کو دے دی کہ اسے مکان بنانے کے لئے قرضہ چاہئے۔ اور درجنوں عرضیاں اس نے کئی سرکاری دفتروں میں بھیجیں کہ جلدی سے روزگار دیا جائے۔

میں نے پہلی بار کسی پنسل کا منہ چوما اور پہلی بار کسی کاغذ سے بغل گیر ہوا۔ نقشہ نویس نے مجھے نہایت خوبصورت نیلے کاغذ میں لپیٹ لیا اور میرے مالک سے کہنے لگا۔ "تیس روپیہ نقشہ بنوائی۔ تیس روپے کمیٹی والوں کے اور تیس روپے نقشہ پاس کرنے کے۔"

میرے مالک نے نقشے والے کو پیسے دے دیئے۔ کمیٹی والوں کی فیس ادا کردی مگر اس نے نقشہ پاس کرانے کا کچھ نہ دیا اور کہا۔ "میں آزاد ملک کا ایک شریف شہری ہوں۔ اپنے وطن میں گھر بنانا میرا حق ہے اور اگر میرے گھر کا نقشہ کمیٹی کے اصولوں کے مطابق ٹھیک ہے؟ تو یہ ضرور پاس ہونا چاہیے۔" نقشہ نویس نے بہت سمجھایا مگر میرے مالک کو اپنے اصولوں پر ناز تھا۔ خیر میں ایک فائل میں لگ کر کمیٹی میں داخل ہوگیا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ کمیٹی کے دفتر میں کھڑے کھڑے میری ٹانگیں اکڑ گئیں۔ ایک دن ایک افسر نے دوسرے کے کان میں کہا۔ "اس فائل کو دبا رکھو، جسے نقشہ پاس کرانا ہوگا۔ اپنی مٹھی ڈھیلی کرے گا۔" اور مجھے جیتے جی ہی ایک ٹوٹی ہوئی میز کی قبر میں دبا دیا گیا۔

جوں جوں میری سانس گھٹنے لگی، میں سوچنے لگا کہ مجھے تو پہاڑوں اور بیلچوں سے کھیلنا تھا۔ سرخ اینٹیں، سلیٹی سیمنٹ اور پھر میرا قد اور بت بڑھتا جاتا، میری لکیریں ابھرتی جاتیں۔ مزدور عورتوں کے لال پیلے دوپٹے ہوا میں اڑتے۔ چاندی کی چوڑیاں میرے کانوں میں کھنکتیں، کانچ کی چوڑیاں میرے اردگرد چھن چھن کرتیں اور مزدوروں کے جسموں میں سے محنت کے پسینے کی مہک آتی۔۔۔۔ اور پھر۔۔۔۔ پھر میرا مالک اپنی محبوبہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر میری طرف اشارہ کرتا، "ہمارا گھر،

میری جان' ہمارا اپنا گھر!" اور پھر میرا مالک اپنی بوڑھی ماں کو اپنے ہاتھ کا سہارا دے کر میری طرف لاتا "اماں' تم نے مجھے مصیبتیں جھیل کر پالا تھا۔ دیکھو میں نے تمہارے لئے گھر بنا لیا ہے اور پھر میرے مالک کے تصور میں ایک ننھا سا بچہ کھیلنے لگتا۔

مگر میں تو جیتے جاگتے ہی ایک ٹوٹی ہوئی میز کی قبر میں پڑا ہوا تھا۔ اور پھر ایک دن مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی آہستہ آہستہ میری قبر کو کھود رہا ہو۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ میں نے اپنی ساری توجہ مرکوز کی۔ دل میں امیدیں بندھنے لگیں۔ مگر افسوس! یہ تو چوہے تھے جو میرے پیروں کو کتر رہے تھے۔ میری ایڑیوں کو کتر رہے تھے' میرے گھٹنوں کو کتر رہے تھے۔ میری امیدوں کو کتر رہے تھے۔

اور پھر قیامت کا دن آگیا۔ میں اور میرے جیسے اور کتنے ہی لوگ قبروں سے نکالے گئے۔ کمیٹی کا ایک افسر عزرائیل فرشتے کی طرح ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنے منشی کو حکم دیا کہ یہ سب نقشے ان کے مالکوں کو واپس کر دو۔ یہ نقشے پاس نہیں ہو سکتے' کیونکہ انہیں چوہے کتر گئے ہیں۔

میں رینگتے رینگتے اپنے مالک کے پاس پہنچا۔ نقشہ نویس نے میرے مالک سے بڑے تجربہ کار جیسی سنجیدہ آواز میں کہا۔ میں نے کہا تھا نا' کہ چاندی کے پہیوں کے بغیر یہ گاڑیاں نہیں چل سکتیں! آپ خواہ اصولوں کے کتنے ہی انجن ان کے آگے جوڑ دیجئے۔"

میرے مالک کی آنکھوں بھر آئیں اور میں نے منت سے کہا۔ "چلو' اگر میرے نصیب میں اس زمین پر پاؤں رکھنا نہیں لکھا ہے' تو مجھے پہلے ہی کی طرح اپنے دل میں بٹھا لو۔ اپنے دماغ میں ہی رکھ لو۔۔۔"

"اب تو تم وہاں بھی نہیں رہ سکتے۔۔۔" میرے مالک نے ایک لمبی سانس لی اور کہنے لگا۔ "کیونکہ وہاں بھی بہت سے چوہے پیدا ہو چکے ہیں۔ تمہارا نچلا دھڑ تو پہلے ہی کترا جا چکا ہے' وہاں اوپر کا دھڑ بھی کترا جائے گا۔"

"تمہارے دل اور دماغ میں چوہے؟"

"ہاں میرے دوست جس طرح یہ کمیٹی والے ایسے چوہے پالتے ہیں۔ جو

مکانوں کے نقشے کتر جاتے ہیں۔ اسی طرح سماج والے بھی ایسے چوہے پالتے ہیں جو خوابوں کے نقشے کتر ڈالتے ہیں۔"

"تمہارے قرضے کی عرضی کا کیا ہوا؟"

"سرکار نے جانچ پڑتال کی تھی کہ میرے پاس پہلے سے کوئی میرا اپنا گھر تو نہیں؟ میری ماں کے پاس کوئی اپنا گھر تو نہیں؟ میرے باپ کے پاس کوئی اپنا گھر تو نہیں؟ ہندو خاندان کو چونکہ مشترکہ خاندان سمجھا جاتا ہے' اس لئے میرے کسی بھائی بند کے پاس کوئی اپنا گھر تو نہیں؟ "اور پھر میرے دادا پڑدادا کا وراثت میں چھوڑا ہوا کوئی گھر تو نہیں؟ اور اگرچہ میں نے سرکار کو یقین دلایا تھا کہ جب سے بندر کی نسل سے انسان پیدا ہوا ہے' میرے خاندان میں کبھی کسی کے پاس اپنا گھر نہیں تھا' مگر اس کے باوجود انہوں نے نہ جانے میری عرضی کو کس طرح کی افیون کھلا دی ہے کہ وہ کسی میز کی دراز میں جا سوئی۔"

"اور تمہارے روزگار کی عرضی؟"

"وہ اس طرح کی بن گئی ہے جیسے کوئی کنواری لڑکی بر ڈھونڈتے ڈھونڈتے بوڑھی ہو جائے۔"

"اور تمہاری محبت کی عرضی۔؟"

"اس لڑکی کا باپ کہتا ہے کہ جس کے پاس گھر نہیں' روزگار نہیں' اسے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

اور میرے مالک نے مجھے بڑی عزت سے ایک گھورے پر رکھ دیا اور خود اپنی زمین کا سودا کرنے کے لئے چل پڑا۔ جسے بیچ کر اسے چولہے میں آگ جلتی کچھ لکڑیاں خریدنی تھیں۔

"میں؟" میں نے گھبرا کر اپنے جاتے ہوئے مالک کو آواز دی۔

میرے مالک نے ایک منٹ ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا۔ اور پھر بڑے اطمینان سے جوابدیا۔ "اگر تمہیں اپنی اتنی ہی فکر تھی' تو تمہیں کسی سیٹھ بیوپاری کے دل میں جا بیٹھنا تھا۔ پھر تمہارا ایک چھوٹا سا گھر تو کیا محل تک بھی بن جاتا۔"

"تم مجھے غلط سمجھے ہو' میرے مالک۔ میں تو صرف اس آدمی کے چھوٹے سے گھر کا نقشہ ہوں۔ جس کے دسوں ناخنوں میں' کہتے ہیں' برکت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

اور میرا مالک اپنے دسوں ناخنوں کو بار بار دیکھتا ہوا گلی میں سے باہر چلا گیا۔